اقبالیات

(شمارہ نمبر ۱۶)

مُرتّب

پروفیسر بشیر احمد نحوی

اِقبال اِنسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی

اقبالیات

(شمارہ ۱۶)

مدیر

پروفیسر بشیر احمد نحوی

مجلس ادارت

☆ پروفیسر عبدالحق

☆ ڈاکٹر تسکینہ فاضل

☆ محمد اعجاز اشرف

☆ شہناز اقبال قریشی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

جملہ حقوق بحقِ اقبال انسٹی ٹیوٹ محفوظ ہیں

نام جریدہ: اقبالیات

مدیر: پروفیسر بشیر احمد نحوی

سالِ اشاعت: فروری ۲۰۰۵ء

تعداد: پانچ سو

قیمت: ۱۰۰ روپے

مطبع: شارجہ پرنٹرس، سرینگر

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ایڈیٹر	i
۲۔	اقبالیاتی ادب (اُردو): ایک مختصر مطالعہ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	1
۳۔	علامہ اقبال اور علی شریعتی کے تصوراتِ فن وادب: ایک تقابلی جائزہ	پروفیسر قاضی عبید الرحمان ہاشمی	11
۴۔	داؤد ثانی حضرت اقبال	مرزا عارف بیگ	25
۵۔	اقبال اور رواداری کا نظریہ	پروفیسر مرغوب بانہالی	28
۶۔	اقبال کے کلام میں ''حیدرؓ'' اور اس سے وضع کی گئیں اصطلاحیں	محمد بدیع الزمان	41
۷۔	بیسویں صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اقبال	ڈاکٹر سید عبد الباری	51
۸۔	شورش کاشمیری کی شاعری پر فکرِ اقبال کے اثرات	پروفیسر بشیر احمد نحوی	74
۹۔	حیات، دستور العمل اور علامہ اقبال	رسول پونپر	84
۱۰۔	اردو ادب پر اقبال کے اثرات	ڈاکٹر تسکینہ فاضل	98
۱۱۔	اقبال اور تصورِ ولایت: ایک مطالعہ	سید محمد فضل اللہ	107
۱۲۔	چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں	سید مجید اندرابی	111
۱۳۔	عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی	123
۱۴۔	فکرِ اقبال میں تصورِ شعر	محمد اعجاز اشرف شاہ	133
۱۵۔	ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری	ایس۔ اقبال قریشی	148

اداریہ

کشمیر، لاہور اور بھوپال میں اقبال کے فکر وفن پر بالخصوص اور دیگر متعدد شہروں میں بالعموم جو ادبی، تنقیدی، توصیفی اور تحقیقی کام انجام دیا جارہا ہے، اس کو بہر حال اربابِ ادب اور عاشقانِ اقبال تعریف و تحسین کی نظر سے دیکھ رہے ہیں جیسا کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کو ہندو پاک سے موصول شدہ درجنوں خطوط سے محسوس ہورہا ہے۔ اقبال کی ہمہ پہلو شخصیت، ان کے دانشورا: نظریات، ان کے دینی اور ملی افکار، ان کی آفاقیت اور دیگر مسائل پر ہر سال کتابیں اور رسالے منظر عام پر آرہے ہیں۔ یہ سلسلہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا اور ساٹھ سال سے بھی زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہ عمل برابر جاری وساری ہے۔ زمانہ جس قدر آگے بڑھتا چلا جائے گا، اقبال کے کلام اور پیغام کی اہمیت اسی انداز میں بڑھتی اور توسیع پذیر ہوتی رہے گی۔ اس کے نظریات کے نئے معانی و جہات اور جدید تناظرات میں نئی تعبیریں اور تاویلیں ہوتی رہیں گی۔

اقبالیات کا تازہ ترین شمارہ نئے موضوعات، نئے افکار اور نئی سوچ لیکر آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ یہ اقبالیات کا سولہواں شمارہ ہے اور اس کے توسّط سے ہم اقبال کی دانشِ برہانی، نورِ بصیرت اور آتشِ رفتہ کے شراروں کو اطراف واکناف میں بکھیرنے کی ایک کوشش کررہے ہیں تاکہ جو خواب اقبال نے ایشیائی مسلمانوں اور دنیا کی مظلوم و مجبور قوموں کے بارے میں دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر ہوجائے۔ ہماری ایک اور کوشش اقبالیات کو وسعت دینے کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ بزرگ ماہرین اقبالیات اب زندگی کے اس مرحلے پر آگئے ہیں جہاں غروب اب ان کا مقدر ہے اور انہوں نے جو قابلِ تحسین کام انجام دئے ہیں اس کو ہم تحسین وآفرین کے کلمات پیش کرتے ہیں، لیکن نژادِ نو سے

وابستہ اقبال کی فکر کے شیدائیوں کو آگے بڑھانے اور ان کی عزت افزائی کرنے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ آنے والے وقتوں میں اقبالیین کی ایک اچھی خاصی تعداد ہماری دانشگاہوں میں مصروفِ عمل ہو۔ پیش نظر شمارے میں چند نامور قلمکاروں کے رشحاتِ قلم شامل ہیں اور ہم نے کئی اہم شخصیات کو بھی لکھا تھا لیکن ان کی عمر، ذاتی مجبوریوں، صحت کے مسائل اور دیگر معاملات انہیں لکھنے سے روک رہے ہیں۔ بہر حال جن حضرات نے اس شمارے کے لئے اپنے مقالات و مضامین اشاعت کیلئے بھیجے، ان کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں اور اہلِ علم سے استدعا کرتا ہوں کہ ہماری کوتاہیوں کی نشاندہی فرما کر صحت مند تجاویز سے مستفید فرمائیں۔

بشیر احمد نحوی

۲۶ جنوری ۲۰۰۵ء

رفیع الدین ہاشمی

اقبالیاتی ادب (اُردو): ایک مختصر مطالعہ

(ہندوستان: آغاز تا ۱۹۴۷ء + پاکستان: ۱۹۴۷ء تا حال)

شیخ سر عبدالقادر (۱۸۷۴ء-۱۹۵۰ء) اُردو میں مطالعہ اقبال کے بانی اور پہل کار (Pioneer) ہیں۔

اگرچہ ''زبان'' (دہلی، نومبر ۱۸۹۳ء، فروری ۱۸۹۴ء) اور ''شورِ محشر'' لاہور (دسمبر ۱۸۹۶ء) میں چند غزلوں کی اشاعت لاہور کے مشاعروں میں شرکت اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے (۳ فروری ۱۹۰۰ء) میں پیش کردہ نظم ''نالۂ یتیم'' کے ذریعے چند محدود حلقوں میں اقبال متعارف ہو چکے تھے، مگر وسیع تر شعری و ادبی دنیا میں ان کے تعارف اور رونمائی کا اعزاز سر شیخ عبدالقادر کو حاصل ہے، جنہوں نے ''مخزن'' (اپریل ۱۹۰۱ء ص ۳۳) میں ان کی نظم ''کوہستان ہمالہ'' شائع کرتے ہوئے قارئین کو بتایا کہ علوم مشرقی و مغربی، دونوں میں صاحبِ کمال ..... شیخ محمد اقبال صاحب انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرا ورڈزورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں ۔۔۔'' پھر ''مخزن'' میں اقبال کی غزلوں اور نظموں پر تعارفی و تنقیدی شذرات (نوٹس) کے بعد، اقبال پر ان کا پہلا مضمون ''خدنگِ نظر'' (لکھنو ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ شیخ صاحب نے ازاں بعد سے سوانحی اور تنقیدی مضامین لکھے، جن میں ''بانگ درا'' کا دیباچہ تو اقبالیاتی تحریروں میں ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں بیسویں صدی کے ربع اول میں اقبال کو متعارف کرانے والوں میں شیخ سر عبدالقادر سرفہرست ہیں۔

اگلے برس ''تنقید ہمدرد'' (قلمی نام حکیم عبدالکریم برہم) نے اقبال کی شاعری کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ''اُردوئے معلیٰ''، یکم اگست ۱۹۰۳ء) جس پر ایک قلمی معرکہ آرائی شروع ہوگئی جس میں خود اقبال کو بھی حصہ لینا پڑا۔ مخزن، اکتوبر ۱۹۰۳ء) ابتدائی دور کا دوسرا اہم نام محمد دین فوق کا ہے۔ اقبال کی اولین سوانحی کتابوں میں اکثر و بیشتر فوق ہی کے بیانات (۱۹۰۹ء، ۱۹۳۲) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ مطالعہ اقبال کی پیش رفت میں نظم ''شکوہ'' (۱۹۱۱ء) کے ردعمل میں لکھی جانے والی نظموں، ازاں بعد اسرار خودی (۱۹۱۷ء) کے حوالے سے قلمی معرکہ آرائی نے بھی اقبالیاتی ادب میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ تا آنکہ صدی کا پہلا اربع ختم ہوتے ہوتے پیام مشرق (۱۹۲۳ء) اور بانگِ درا (۱۹۲۴) نے اقبال پر تعارفی و توضیحی اور تنقیدی تحریروں کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ نیرنگ خیال کا اقبال نمبر (۱۹۳۲) اقبالیاتی ادب کے دور اول میں ایک اہم اضافہ اور قابلِ ذکر دستاویز ہے۔ پھر اقبال کے شعری مجموعوں کی اشاعت اور ان کی وفات نے اقبالیاتی مطالعے کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ ۱۹۴۷ء تک معروف علمی و ادبی پرچوں میں بلا مبالغہ سینکڑوں مضامین چھپے، بعض وقیع اقبال نمبر نکلے اور چند کتابیں شائع ہوئیں۔ (سب سے اہم روح اقبال از یوسف حسین خان)

بیسویں صدی کے نصف اول کے ذخیرۂ اقبالیات پر مجموعی نظر ڈالیں تو زیادہ تر تحریریں تشریحی اور توضیحی نوعیت کی ہیں اور ان میں اقبال کی تحسین و توصیف کا عقیدت مندانہ رجحان غالب ہے، البتہ بعض اہل قلم کے ہاں ایک گہرا تنقیدی شعور اور تجزیہ و تحلیل کا یک بہتر معیار ملتا ہے۔ ''تنقید ہمدرد'' سے جس سے مخالفانہ تنقید کا آغاز ہوا تھا، اس کا اسیک اور زاویہ اس وقت سامنے آیا جب اقبال کے بعض معاصرین نے ان کے افکار سے اختلاف کیا۔ خصوصاً ترقی پسند نقادوں (سبط حسن، اختر حسین رائے پوری وغیرہ) کی طرف سے اختلافات اور مخالفت سے آگے بڑھ کر آگے بڑھ کر تعصب اور عناد کے چھینٹے بھی اڑائے گئے۔ برکت علی گوشہ نشین (اقبال کے شاعرانہ زوال، ۱۹۳۱ء اور مکائد اقبال ۱۹۳۵ء) کی فرقہ پرستی اور تعصب نے جارحانہ عناد کی شکل اختیار کر لی۔

اقبال کے بعض قارئین کو یہ شکوہ تھا کہ ''اقبال ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا'' کہتے کہتے ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگے۔ پنڈت نرائن ملا نے بھی یہی شکوہ کیا:

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا

اسی پس منظر میں خطبہ الہ آباد پر بعض ہندو اخباروں نے شدید ردعمل ظاہر کیا۔ ''پرتاپ'' نے علامہ کو ''شمالی ہندوستان کا ایک خوفناک مسلمان'' قرار دیا اور لکھا ''وہ شاعر ہے نہ فلاسفر، نہ محبِ وطن ہے، وہ ایک تنگ خیال، تنگ نظر اور انتہا درجے کا متعصب مسلمان ہے۔''

بہر حال اقبالیات کے اس ذخیرے سے ایک بات تو بہت واضح ہے کہ اقبال اپنی زندگی ہی میں ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم (۱۹۴۷ء) تک مطالعہ اقبال کے جو مختلف روپ نظر آتے ہیں، آگے چل کر انہوں نے نسبتاً واضح شکل اختیار کر لی۔

یہاں مطالعہ اقبال کا ایک دور ختم ہوتا ہے، اس کے بعد بھارت اور پاکستان میں مطالعہ اقبال کی جہتوں نے ایک دوسرے سے قدرے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، یہاں کے سیاسی، تعلیمی اور علمی و ادبی حلقوں میں ذکرِ اقبال اور مطالعہ اقبال کی جانب ایک والہانہ رغبت بالکل فطری بات تھی۔ اقبال کی تعریف و تحسین کے ساتھ، ان پر ادبی نقد و انتقاد، کلامِ اقبال کی توضیح و تشریح اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم ہونے لگے۔ ''اقبالیات'' ایک علمی و ادبی شعبے کی حیثیت سے رو پذیر ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں محدود پیمانے پر اقبال کا صد سالہ یومِ ولادت منایا گیا۔ ۱۹۷۷ء کو سرکاری طور پر ''اقبال صدی'' کا نام دیا گیا اور حکومت پاکستان کی سرپرستی میں لاہور میں ۶ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء پہلی عالمی (اور تا حال تاریخ اقبالیات کی سب سے بڑی) اقبال کانگریس منعقد ہوئی۔ سال اقبال کے دوران تعلیمی اور علمی اداروں میں وسیع پیمانے پر تقریبات

منعقد ہوئیں، جس سے ملک میں ایک عمومی اقبالیاتی فضا پیدا ہوتی چلی گئی۔ ہمارے اہلِ قلم اور ناشرین نے بھی محسوس کیا کہ اقبالیات ایک پرکشش موضوع ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں اقبالیاتی ادب کا ایک متنوع سیلاب اُمڈ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے رطب یابس کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ صدی کے ربع آخر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی نت نئی کتابیں اور مضامین چھپ رہے ہیں۔ شاید اقبالیاتی ادب کی کائنات ناتمام ہے۔۔۔

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا بھر میں اقبالیات پر شائع شدہ چھوٹی بڑی کتابوں اور مجلّات کے خاص نمبروں کی تعداد دو ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے۔ (ہزار ہا مضامین اس کے علاوہ ہیں)۔ اس بحرِ ذخار کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ''اقبالیات پاکستان'' پر مشتمل ہے۔ مطالعہ اقبال میں یہ پیش رفت حیرت انگیز ہے۔ اس برق رفتار ترقی اور فروغ پذیری کو علامہ اقبال کی طلسماتی شخصیت کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔ نصف صدی میں اقبال کے تعلق سے وجود میں آنے والا ''اقبالیاتی ادب'' مختلف النوع اور ہمہ گیر ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ عبدالقادر ''مسٹر محمد اقبال ایم اے'' کو اُردو دنیا میں متعارف کرا رہے تھے، لیکن ایک صدی کے بعد آج انہیں اُردو کا یا کم از کم بیسویں صدی کا سب سے بڑا اُردو شاعر تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہے۔

اقبالیات، اقبالیاتی ادب یا مطالعہ اقبال کی حدود خاصی وسیع ہیں۔ اگر صرف ذخیرۂ کتب و رسائل کو دیکھیں تو اس کے تنوع، ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ ہو جائے گا، اس میں طرح طرح کی چیزیں شامل ہیں۔ مثلاً

۱۔ اقبال کے متداول اور متروک کلام کے مجموعے
۲۔ نظم و نثر اقبال کے تراجم
۳۔ سوانح اور شخصیت پر کتابیں اور ملفوظات کے مجموعے
۴۔ حوالہ جاتی کتابیں (فرہنگیں، کتابیات، اشاریے)

۵۔ کلام اقبال کی شرحیں

۶۔ اقبال کے افکار و تصورات اور شعری فن پر تحقیقی و تنقیدی اور توضیحی کتابیں

۷۔ اقبال پر منظوم کتابیں

۸۔ متفرق کتابیں (بچوں کے لئے کتابیں، نصابی کتابیں، سووینیر، کوئز کتابیں وغیرہ)

۹۔ علمی اور ادبی رسائل کے اقبال نمبر

۱۰۔ یونیورسٹیوں کے امتحانی تحقیقی مقالے (Dissertations)

اس طرح اقبالیات کا تحریری ذخیرہ کم و بیش دس شاخوں میں پھیلا ہوا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اقبالیات کے ان وسیع پہلوؤں پر بہت کچھ شائع ہوا اور یہ شاخیں خوب برگ و بار لائیں۔ مگر ان چند صفحات میں اس وسیع الاطراف ادب کا جائزہ و تجزیہ پیش کرنا، مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ چند اشارات اور اہم بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ کچھ بنیادی مصادر منصۂ شہود پر آئے ہیں، جو ذخیرۂ اقبالیات میں دریافت و بازیافت اور بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اقبال کی شعری و قلمی بیاضیں اور نظم و نثر کے بعض دست نوشت مسودے، جن میں تاریخ تصوف کے چند ابواب، بیدل پر ایک انگریزی مضمون، خطبہ علی گڈھ کا ایک مکمل مسودہ اور (Stray Reflections) زیادہ اہم ہیں۔

۲۔ سینکڑوں اُردو اور انگریزی خطوط کی دریافت جن کی ایک بڑی تعداد اقبال کی دست نوشت ہے۔

۳۔ اقبال کے فارسی اور اُردو کلام کے متن پر تحقیق اور کلیات باقیاتِ شعر (اُردو) کی ترتیب و تدوین (صابر کلوروی)

۴۔ انگریزی خطبات کے متن پر تحقیق اور اس کا ایک معیاری تحقیقی ایڈیشن (محمد سعید شیخ)، اسی طرح انگریزی مضمون (Bedil in the Light of Bergson) کی تحقیقی تدوین و ترجمہ (تحسین فراقی)

۵۔ اگرچہ اقبال ذاتی طور پر شاعری کے ترجموں کے قائل نہیں تھے تاہم ازراہِ عقیدت مندی یا بطور تجربہ یا ترجمہ بطور ایک ادبی مشق اس کے بیسیوں ترجمے ہوئے ہیں۔ اُردو سے انگریزی، فارسی سے اُردو اور انگریزی میں اور تمام علاقائی زبانوں میں (جن پر الگ بحث ہوگی) تراجم سے اقبالیین کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ہر مجموعہ کئی کئی زبانوں میں اور بعض زبانوں میں ایک ایک کتاب کے کئی کئی تراجم چھپ چکے ہیں۔ خطبات اقبال (Reconstruction...) جیسی ادق کتاب کے پانچ مکمل ترجمے کو کتابی شکل میں شائع ہوئے اور مختلف خطبوں کے الگ الگ ترجمے اس پر مستزاد ہیں۔

۶۔ حوالہ جاتی ادب کے ضمن میں بھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے لیکن ابھی اس باب میں بھی منظم طور پر کام کرنے ضرورت ہے۔

۷۔ سوانح عمریوں کے باب میں حسرت اور طاہر فاروقی کی ابتدائی کاوشوں کے بعد ذکرِ اقبال (۱۹۵۸ء) اقبال کی باقاعدہ سوانح عمری ہے۔ مگر یاد اقبال (۱۹۷۷ء) سرگزشت اقبال (۱۹۷۷ء) دانائے راز (۱۹۷۹ء) اور مفکرِ پاکستان (۱۹۸۲ء) کے بعد یہ خاصی ناقص محسوس ہوتی ہے۔ زندہ رود سب سے بہتر، جامع اور سب پر فائق ہے۔ مگر حرف آخر پر بھی نہیں کیونکہ نظر ثانی و اضافوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ بعض کتابوں کی حیثیت جزوی سوانح کی ہے، جیسے اقبال کی ابتدائی زندگی (۱۹۸۶ء) اور عروج اقبال (۱۹۸۷ء)۔ سوانحی ذخیرے میں اقبال سے ملاقاتوں کی یادداشتوں کا بڑا قابل ذکر ذخیرہ سامنے آیا ہے۔ باقاعدہ سوانح کے علاوہ، چند سوانحی کتابیں بھی چھپی ہیں۔ جن میں اقبال کی تاریخ ولادت، ان کی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے یا ان کی سیاسی زندگی کی مباحث اہم اور دلچسپ ہیں۔

۸۔ کلامِ اقبال کی شرحوں پر یوسف سلیم چشتی نے بطور خاص توجہ دی ہے یا ایک حد تک غلام رسول مہر نے۔ بعد اکا دُکا شرحوں سے قطع نظر، اس باب میں ایک خلا موجود ہے۔ تشریح اشعار کے سلسلے میں دلچسپ بحثیں اور مذاکرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

۹۔ ''بچوں کا اقبال'' کے سلسلے میں دو ہی بہتر کام ہوئے۔ درسیات اقبال (عبدالرشید فاضل) اور میرا اقبال (سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ)۔ موخرالذکر ایک مثالی کام ہے۔

۱۰۔ تحقیق وتنقید کے ضمن میں بہت کچھ ہوا، بلکہ پاکستانی اقبالیات (اُردو) کا تقریباً ڈیڑھ سو مقالات لکھے گئے مگر پی ایچ ڈی کے لئے تمام جامعات میں (اُردو میں) ایک درجن تحقیقی مقالے بھی نہیں لکھے گئے۔ پاکستان کی جامعات میں اس کے نظریاتی بانی سے یہ عدم توجہی ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

پاکستان میں مطالعہ اقبال کے نتیجے میں کتابوں اور رسالوں کا جو عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا، اس میں طرح طرح کے رجحانات اور رویے ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تحسین و توصیف کا رویہ غالب رہا اور اقبال کی پیغمبرانہ حیثیت کو سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اقبالیاتی مصنفین کی عظیم اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اقبال کی فکری اساس قرآن حکیم پر استوار ہے۔ دوسرا رویہ اقبال سے اختلاف کا ہے۔ جس کے تحت مختلف نقادوں نے اپنے معتقدات کی روشنی میں اقبالیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اختلافی بحثیں، خودی، تصوف، سیاسی تصورات، قوت پیکار (بہ علامت شاہین) وغیرہ ملتی ہیں۔ پھر سماجی و معاشی تصورات پر اشتراکیوں کا اختلاف جو کہیں اقبال شکنی کا رجحان بن جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی شخصیت کو منہدم یا اسے مجروح کرنے کی شعوری کوشش ہو رہی ہے۔ البتہ اقبال کے بیشتر نقادوں کا رویہ متوازن اور معقول ہے۔ انہوں نے بعض امور میں اقبال سے اختلاف کیا مگر ان کی قرار واقعی ستائش و تحسین میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ان کا رویہ ناقدانہ ضرور ہے، مگر مخالفانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے۔

بعض اقبالیاتی مباحث بھی لائق ذکر ہیں۔ ایک قلمی مباحثہ سلیم احمد کی کتاب (اقبال ایک شاعر) نے پیدا کیا۔ سلیم احمد کی تحسین ہوئی اور ان پر تنقید بھی، بایں ہمہ سلیم احمد کے ان سوالات کا تشفی بخش جواب سامنے نہیں آسکا کہ ہمارے شعراء کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات کیوں نہیں قبول کئے اور ہمارے اہم ترین نقادوں (عسکری، مجنون، فراق

وغیرہ) نے اقبال سے خاطر خواہ اعتنا کیوں نہیں کیا؟

اقبال، اجتہاد اور تعبیر شریعت کی بحث میں محمد یوسف گورایا نے اقبال کو اس دور کا مجدد بلکہ ''مجتہد مطلق'' قرار دیا۔ اس بحث میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا، مگر اس سوال کے تشفی بخش جواب سامنے نہ آیا کہ اجتہاد اور تعبیر شریعت کا اختیار جس پارلیمنٹ کو دیا جائے گا اس کے ارکان کا معیار کیا ہوگا؟ مروجہ جمہوریت میں ہر ایرا غیرا، بد دیانت اور خائن بے تحاشا روپیہ خرچ کر کے یا دھاندلی اور غنڈہ گردی کر کے رکن پارلیمنٹ بن سکتا ہے۔ کیا فی الواقع علامہ اقبال ایسے ہی ''مجتہدین'' کو تعبیر شریعت کا اختیار سونپنا چاہتے تھے؟

گزشتہ صدی کے ربع آخر میں خطبات اقبال (Reconstruction) کی طرف خاصی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ کتابیں، مضامین اور مذاکرے۔ بعض اصحاب نے تو خطبات کو اقبال کا بنیادی مآخذ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اجتہاد کی عمارت علامہ کی اسی ''نمائندہ کتاب'' پر استوار کیا جائے۔ کیونکہ اقبال کی شاعری خطبات کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے، مگر اقبالیات کے بیشتر عالموں اور ماہرین نے اس طرزِ فکر و تحقیق سے اتفاق نہیں کیا۔

علامہ اقبال کے علم الکلام پر، علی عباس جلال پوری اور بشیر احمد ڈار کے درمیان ایک عرصے تک قلمی معرکہ آرائی جاری رہی۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں ناروے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریر اور سردار عبدالقیوم کی جوابی تقریر پر بھی کئی ماہ تک بحث چلتی رہی۔ یہ ''ناروا بحث'' سے موسوم ہوئی۔

پاکستانی کے اقبالیاتی ادب میں بہت سی معیاری کتابوں اور نہایت قابل ستائش اقبال شناسوں کے نام آتے ہیں۔ لیکن اس مختصر تذکرے میں محض نام گنوانا بھی مشکل ہے۔ لیکن چند لوگ آسمان اقبالیات کے روشن ستارے تھے، جو اب غروب ہو چکے ہیں۔ مثلاً یوسف سلیم چشتی، عابد علی عابد، خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر محمد عثمان، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، افتخار احمد صدیقی، ممتاز حسن، محمد رفیق خاور، ڈاکٹر

محمد ریاض، رحیم بخش شاہین۔ پروفیسر محمد منور کو میں ''بابائے اقبالیات کہتا ہوں''۔ خدا ان سب کی روح کو آسودہ رکھے۔ (ممکن ہے کچھ نام رہ گئے ہوں) اور جو اقبال سکالر حیات ہیں، خدا انہیں اقبالیاتی ادب کی عمارت کو بنانے، سنوارنے اور سجانے کی بیش از بیش توفیق بخشے۔

ایک جملہ معترضہ: بھارت کے بعض نقاد کہتے ہیں کہ اہلِ پاکستان علامہ اقبال پر تنقید کے روادار نہیں اور انہوں نے اقبال کو رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ اگر وہ خدوخال اقبال (۱۹۸۶ء، محمد امین زبیری) اقبال کا علم الکلام (۱۹۷۲ء، علی عباس جلال پوری) یا صدائے احتجاج ۱۹۹۰ء، شمیم رجز) جیسی کتابیں دیکھ لیتے یا سردار محمد عبدالقیوم خان کی تقریر سن لیتے یا اقبال کے بارے میں جی ایم سید، غلام مصطفےٰ شاہ اور ابراہیم جوجو کے ''ارشادات'' سے آگاہ ہوتے تو انہیں اندازہ ہوتا کہ پاکستان میں اقبال ''مقدس گائے'' نہیں بلکہ ان پر دل کھول کر مخالفانہ، متعصبانہ اور معاندانہ تنقید کی گئی ہے۔

ایک صدی میں علامہ اقبال پر ہر نوعیت اور معیار و قدر کی کتابیں، مضامین اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی شاعری ہو یا فلسفہ، مابعد الطبیعات، خودی و بے خودی، عقل و عشق، حیات و ممات، خیر و شر، جبر و قدر، حسن و فن، فقر و تصوف اور زمان و مکان کا مسئلہ یا ان کی زندگی اور شخصیت۔۔۔ شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہوگا جس پر خامہ فرسائی نہ کی گئی ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ''اقبالیات کے نام سے جو ذخیرۂ ادب تیار ہو چکا ہے وہ اس پائے کا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔''

۱۹۸۷ء کے گیلیپ پاکستان سروے کے مطابق، پاکستان کے مقبول ترین شاعر علامہ اقبال ہیں۔ اس اعتبار سے اقبالیاتی، پاکستانی علوم و ادبیات کا ایک بڑا موضوع ہے اور اس بڑے موضوع پر کچھ کہنے اور لکھنے کے لئے ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ ہیں:

> ''کئی علوم کی ضرورت ہے۔ مشرق و مغرب کے عام علوم کے ساتھ اسلامی علوم بھی سیکھے جائیں تو بات بنتی ہے۔ محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا

نہیں کر سکتی"

حال ہی میں اقبالیاتی ادب کے ایک شناور اور محقق جناب صدیق جاوید نے سوال اٹھایا کہ مستقبل میں مطالعہ اقبال کے امکانات کیا ہیں؟ اور کیا کوئی تازہ اور نیا مطالعہ پیش کرنا ممکن ہے؟ اور آیا اس کی ضرورت بھی ہے؟ مجھے تعجب ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں سوچا، ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۲۴ء میں اور مشفق خواجہ ۱۹۶۶ء میں (بعد ازاں راقم نے بھی وقتاً فوقتاً) اقبالیات کے جن پہلوؤں اور موضوعات پر کام کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں بیش تر ابھی تک تشنۂ تحقیق چلے آ رہے ہیں۔ اقبال کا متن، اقبالیاتی ادب کی بنیاد ہے اور ابھی تو متنِ اقبال ہی (ماسوائے خطبات کے) ڈھنگ سے مرتب و مدون نہیں ہوا۔ سو راقم کے خیال میں تحقیق و مطالعہ اقبالیات کے بے حد و حساب اور وسیع امکانات موجود ہیں۔ اقبال کا کلام اور ان کا فکر جتنا وسیع اور ہمہ جہت ہے اس کے مطالعے کی گنجائش بھی اتنی ہی زیادہ ہیں:

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

☆

قاضی عبید الرحمان ہاشمی

علامہ اقبال اور علی شریعتی کے تصوراتِ فن وادب
ایک تقابلی جائزہ

علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی ہمارے ان مفکر دانشوروں میں ہیں جن میں ایک حیرت انگیز ذہنی وفکری مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کی زبوں حالی سے غمزدہ اور مضطرب ہیں۔ یہ دونوں جس پائے کی عارفانہ بصیرت کے حامل ہیں اس کے ماتحت ان کے آئینہ ادارک میں حال تو حال مستقبل کے ارتعاشات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ان کے پیش نظر تہذیبی زندگی کی پسپائی اور ایک واضح ثقافتی انحطاط کے ماحول سے مسلم معاشرے کو نکال لینے کا کوئی عارضی حل بھی نہیں ہے۔ان دونوں کی حکیمانہ بصیرت اپنے عہد کے معاشرے میں ایک عظیم انقلاب کی خواہاں ہے،ایک ایسا انقلاب جو زندگی کی ایجابی قوتوں کو ایک نئے راستے پر موڑ دے،ایک نئی زندگی کی بشارت اور نئے موسموں کی خبر دے، میں اگر یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے اقبال کی فکری و دانشورانہ قیادت میں اسلام کی بازیافت اور سربلندی کیلئے شہادتِ حق کی جو مثال قائم کی وہ اس طرح قبول ہوئی کہ ان کے وجود کا تازہ لہو ایک نہایت قلیل مدت میں مسلمانانِ ایران کیلئے ایک نئی صبح لیکر نمودار ہوا۔

ان دونوں فرزندانِ اسلام کے ذہنوں میں جس ہمہ جہت اور ہمہ گیر اسلامی انقلاب کا نقشہ تھا ظاہر ہے وہ فن وادب کی شمولیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا تھا۔آئیے اس فکری پس منظر کی روشنی میں دونوں کے ادبی وفنی تصورات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ دونوں کے خیالات میں مماثلت ومغائرت کی کیا نوعیت ہے؟ سب سے پہلے میں مختصراً اقبال کے

تصورات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ وہ جس انداز کی معاشرتی زندگی کا خواب دیکھ رہے تھے اس میں کس نوع کی فنی وادبی اقدار کو فروغ پاتے اور پنپتے دیکھنا چاہتے تھے۔

فن اور ادب کے بارے میں اقبال کے خیالات بیشتر ان کے اشعار میں بکھرے پڑے ہیں، تاہم انہوں نے مرقع چغتائی کے دیباچہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے اگر بات شروع کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اقبال لکھتے ہیں:

> ''مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کا حاصل بس اس قدر ہے کہ میں سارے فنون لطیفہ کی معنوی صحت زیادہ تر اس روح کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس کے اندر اس کے شعراء اور صاحبانِ فن پیدا کرتے ہیں، لیکن اس روح کی نوعیت کا سوال محض اس کے شخصی ذوقِ انتخاب پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔۔۔ کسی اہلِ ہنر کا مائل بہ انحطاط ضمیر اور تصور ایک کیلئے اٹیلا اور چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تصویریں یا اس کے نغمے جذب و کشش کی طاقت بھی رکھتے ہیں جیسا کہ حضورؐ نے امراء القیس کی بابت فرمایا کہ وہ افضل ترین شعراء میں سے ہے اور دوزخ کی طرف لے جانے میں ان کا امام ہے۔۔۔ جو اہل ہنر نوع انسان کیلئے رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا ربط اپنے ماحولِ حیات کے ساتھ بازمانہ ستیز کا ہوتا ہے، اپنی روح میں وہ زمان کی حقیقت اور ابدیت کو محسوس کرتا ہے۔۔۔ دورِ حاضر طبعی ماحول ہی کو سرچشمۂ فیضان قرار دیتا ہے لیکن یہ فطرت تو صرف ''ہے'' سے زیادہ کچھ نہیں اور اس کا منصب ''چاہیے'' کیلئے ہماری جستجو کا حجاب بنتا ہے۔ صاحبِ ہنر کو اس کا شعور اپنے ہی نفس کی گہرائیوں میں حاصل کرنا چاہیے۔ جہاں تک اسلامی تہذیب کا تعلق ہے میرا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے فنِ تعمیر کے استثناء کے اسلامی

فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، بلکہ کسی حد تک شاعری بھی ہنوز ظہور کے طالب ہیں، وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمحِ نظر اخلاقِ الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنا ہے دراصل انسان کے اندر ایک غیر محدود طلب پیدا کرتا ہے اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت کا مستحق ٹھہراتا ہے''

فن اور ادب کے بارے میں اقبال نے ایک دوسرے موقع پر زیادہ واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں۔

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کیلئے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس، اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آیندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں، اس واسطے کہ آرٹ (فن) غائت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ وقت میں میرے لئے ممکن نہیں''۔

ان خیالات سے یہ بات قدرے واضح ہوتی جارہی ہے کہ اقبال شعر و ادب کے کسی ایسے جامد، منفعل اور انتہا پسندانہ نقطہ نظر کے حامل نہیں تھے جو ادب کو زندگی کے اصل سرچشمہ سے منقطع کردے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک حیات بخش فن وہ ہے جو خودی کی حفاظت اور فروغ میں معاون ہو۔

اگر خودی کی حفاظت کرے تو عین حیات
نہ کرسکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

متعدد اشعار کی وساطت سے جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جمالیاتی ورثے سے پناہ مانگتے ہیں جو ذوقِ حیات اور قوائے حیات کو ناکارہ کر دے، اس کے نتیجے میں قومی زندگی قوتِ مدافعت اور کشمکش کی طاقت کھو بیٹھتی ہے۔ مقصدیتِ فن کے صحیح مسئلہ کے حل ہی پر چونکہ ثقافت کی حقیقی قدروں کی تعیین ہو سکتی ہے اس لئے علامہ اقبال کے نزدیک اس کی اہمیت غیر معمولی ہے اور انہوں نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ قوم کے نوجوانوں میں دو خوبیاں اجاگر ہوتی دیکھنا چاہتے ہیں۔ فکر روشن و صالح اور سوزِ عرب یہ وہ اقدار ہیں جن کی ترویج میں اہل ہنر اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اقبال کی اجتہادی اور انقلابی بصیرت ایک ایسے فن کی پرداخت کی جویا تھی جو مردانِ خود آگاہ کو زندگی کی حریف اور مزاحم قوتوں کے آگے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ دے سکے۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

وہ شعر کہ پیغامِ حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اقبال کے تصور فن و ادب کی بہتر تفہیم کیلئے اس تقریر کا ایک اقتباس پیش کرنا ضروری ہے جو انہوں نے کابل میں نوجوانوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کی تھی، فرمایا:

''میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری
جو بھی ہو ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اور اسی بناء پر

چاہیے کہ میں آرٹ کو ایجاد کہوں نہ کہ تفریح۔ شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے۔۔۔ ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ نوجوانوں کیلئے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں۔ کیوں کہ آرٹ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے تو اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے۔ ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل وصورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند جذبات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔"

اقبال کی حکیمانہ فکر پر سب سے زیادہ روشنی ان کے مضمون "جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ" سے پڑتی ہے، اس کو نظر میں رکھے بغیر اقبال کے تصور کی رفعت اور گہرائی کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس مضمون کی غیر معمولی خوبی یہ ہے کہ اس کے وسیلے سے ہمارے سامنے سرور کائناتؐ کے شعر وادب کے بارے میں اپنے خیالات کیا تھے۔ اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضور مقبول نے امراء القیس کی شاعری کو گمراہ کن بلکہ جہنم میں لیجانے والی شاعری کیوں کہا؟

امراء القیس دراصل اس عہد کی ترغیبات جنسی کا زبردست ترجمان تھا۔ داستانِ حسن وعشق، شراب وشباب، جاں گداز جذبوں، ریگستانی زندگی کے رومان پرور شب و روز اور سنسان ریتلے پہاڑوں کی ہولناکیوں وغیرہ اس کے موضوعات تھے جو اس کی شاعرانہ تخیل کی بنیادی کائنات کا درجہ رکھتے تھے۔ حضورؐ نے اس شاعری کے حوالے سے جو بات فرمائی ہے وہ تمام فنونِ لطیفہ پر صادق آتی ہے، آپ کا فرمانا کس قدر واضح ہے کہ صنائع وبدائع کے محاسن کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہوں، یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلا علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشہ

دکھادے، شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کے بجائے وہ فرسودگی اور انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھادے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھادیا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے۔ نہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔''

اقبال لکھتے ہیں کہ ایک بار قبیلہ بنوقیس کے مشور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضورؐ کو سنایا گیا جس کا مفہوم ہے کہ میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ میں اکلِ حلال کے قابل ہوسکوں، حضورؐ سرورِ کائنات اس شعر کو سن کر اس کی معنوی بلاغت سے اس درجہ مسرور ہوئے کہ اپنے اصحابؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

''کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔''

عنترہ بھی کیا خوش نصیب انسان تھے کہ ان کے ایک شعر نے توحید کے فرزند اعظمؐ کو اس درجہ متاثر کردیا کہ وہ جن کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا کسی بھی انسان کیلئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، وہ خود عنترہ سے ملنے کے آرزومند ہوگئے۔ حضورِ کائناتؐ نے عنترہ کو جو عزت بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ (علاوہ ازیں) آپ نے جو اس قدر اس شعر کی تعریف فرمائی اس سے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ (فن) حیاتِ انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہیں رکھتا۔

ہر وہ استعداد جو مبدۂ فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصد وحید اور غائت انعامیات کیلئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو۔ ہر انسانی ہنر

کواس غایت آفریں کا تابع اور مطیع ہونا چاہیے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے، اقبال مزید کہتے ہیں کہ وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جیتی جاگتی حقیقتیں جو ہمارے سامنے گردوپیش میں موجود ہیں (کہ انہی پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں۔ انحطاط اور موت کا پیغام ہے، صنعت گر یعنی (فنکار) کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیے، مصورِ فطرت کو اپنی رنگارنگ نگارآرائیوں کا اعجاز دکھانے کیلئے افیون کی چکی سے احتراز لازم ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال (ہنر) اپنی غائت آپ ہے، انفرادی اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دیکر چھین لی جائے، غرض یہ کہ رسولِ مقبولؐ کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ ہنر کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقا کیا ہونی چاہیے۔"[1]

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے ادب اور فنونِ لطیفہ کی مقصدیت، افادیت اور تعمیریت کا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اس کی حمایت کسی نہ کسی انداز میں دنیا کے ان ممتاز فلسفی نابغہ روزگار دانشوروں نے بھی کیا ہے جنہیں ڈاکٹر علی شریعتی اپنے قائم کردہ مخروط میں انتہائی بالائی حصے میں جگہ دیتے ہیں۔ میری مراد افلاطون، فشز، ٹالسٹائے جان رسکن، وہائٹ ہیڈ وغیرہ سے ہے، ڈاکٹر علی شریعتی نے اس فہرست میں جان پال سارتر، برٹینڈ رسل اور شوآرز وغیرہ کا اضافہ کیا ہے اور انہیں اس بات پر مطلق حیرت نہیں ہوتی کہ منجملہ دیگر دانشوروں کے میکس پلینک، کیرل اور آئن اسٹائن کی تحریروں میں جابجا قرآنی الفاظ یا فہم قرآن سے حاصل شدہ تعبیرات ملتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو برملا طور پر ایک روحِ اعلیٰ اور عقلِ کل کے کائنات پر متصرف ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور نوعِ بشر کو مذہب اور مذہبی عبادات کا ضرورت مند مانتے ہیں۔

۱۔ تصدق حسین تاج، مضامینِ اقبال، حیدرآباد۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر مصنف اقبال اور جمالیات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اقبال نے فن کو وارثِ پیغمبری کا رفیع المرتبت مقام عطا کر کے اس کی عظمت و شان کو چار چاند لگا دئے ہیں اور اس سے۔اس کی مقصدیت خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے۔

اقبال کے ہاں فن اور فطرت کے تعلق سے بھی اس مسئلے پر کچھ کارآمد اشارے ملتے ہیں۔جب وہ کہتے ہیں:

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنرمند کہ نخچیر؟

تو یہ وہ ہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ فنکار فطرت کا غلام نہیں بلکہ اس کا آقا اور فاتح ہے۔ایک سچا فنکار اپنے خونِ جگر کی وساطت سے اس کائنات آب و گل کے متوازن ایک نئی تازہ کار اور ابدی شانِ بہار کی حامل کائنات کی تخلیق کرنے پر قادر ہے۔البتہ وہ جس جہانِ نو کی آفرینش کا ذمہ دار ہے وہ ایک پلاسٹک جہان ہے۔جس میں مٹی اور پتھر کی جگہ شعری اور تخیلی وضع اور ہیئتیں ہیں، یہاں جو خطوط و الوان ہیں وہ مصور کے مو کے قلم کی یادگار ہیں، یہ وہ زندہ و تابندہ نقوش ہیں جو ہر زمانے میں اچھی بری انسانی ثقافتوں کا نشانِ امتیاز ہوتے ہیں۔

اقبال نے معاشرے میں سلبی اقدار و ہنر کے نمائندہ مفسد اور دشمنِ انسانیت فن کاروں کی خوب خبر لی ہے۔ہندی او فرنگی فنون میں انہیں زندگی کی رمق کم ہی نظر آتی ہے۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی
مجھ کو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اس سے بھی زیادہ گہرا مظاہرہ ان اشعار میں کرتے ہیں ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریخ میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہندر کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

فن وادب کے جملہ معاشرتی کردار پر اقبال کے وقیع خیالات کے سلسلے میں یہ بھی جاننا ازبس ضروری ہے کہ فنی صلاحیت کا حصول کس طرح ممکن ہے۔ اس بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں لیکن اقبال کا نقطہ نظر ہے کہ فنی صلاحیت کا جوہر گرچہ فنکار کو فطری طور پر ہی ودیعت ہوتا ہے، لیکن اس جوہر کو سنوارنے اور نکھارنے کیلئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ فن اپنی خارجی اور داخلی صورت میں وہبی بھی ہے

اور اکتسابی بھی اور ان دونوں کے متناسب امتزاج اور ہم آہنگی سے فنکاری کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہنر مند ہے آزاد

خون رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مئے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اقبال کے فنی و ادبی تصورات کے اس اجمالی جائزہ کے بعد مماثلت و مغائرت کی صحیح صورت حال کو سمجھنے کی لئے ڈاکٹر علی شریعتی کے تصورات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ یہ عرض کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اقبال چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اس لئے انہوں نے اپنے خیالات بالعموم اپنی شاعری میں پیش کئے ہیں جس کی کچھ مثالیں دی جا چکی ہیں اس کے برعکس ڈاکٹر علی شریعتی شاعری سے کوسوں دور ایک اعلیٰ درجہ کے سماجی مفکر اور مذہبی اسکالر ہیں۔ انہوں نے فن و ادب، فنکاروں کے معاشرتی فرائض اور ہمعصر زندگی میں فنکاری کی ضرورت و اہمیت پر بڑے مدلّل اور سائنٹفک طریقہ سے اظہارِ خیال اپنی فارسی تصنیف میں کیا ہے۔

اگر چہ یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اقبال اگر فن و ادب کے ایک نظریہ ساز ہیں، انہوں نے فن اور فنکاری کے سلسلہ میں کچھ خاص رہنما اصول و ضابطے وضع کئے ہیں تو ڈاکٹر علی شریعتی ان سماجی مصلحین میں ہیں جنہوں نے جدید معاشرہ کے فساد کا جائزہ لینے کے بعد اس کی فنی و جمالیاتی ضرورتوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے باضابطہ ان اصولوں کے عملی

نفاذ کے سلسلہ میں خاص تجاویز پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر شریعتی اقبال ہی کی مانند فن کو انسان کی تخلیق ہستی اور اس کی روح کا مظہر تصور کرتے ہیں۔ اس کی پراسراریت، روحانیت اور حیرت انگیز اثر پذیری کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کی دنیا میں فن زندگی اور مذہبی اقدار سے منحرف ہو چکا ہے تاہم جب بھی وہ ذہنی عیاشی سے ماورا ہوگا، اپنی فطرت کے عین مطابق اپنی روحانیت اور عارفانہ رنگ ہی میں ظاہر ہوگا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال ہے کہ یہ بھی سامراجی ذہنیت کی ایک چال ہے اور ایسا سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے کہ فن کو مذہبی، شریفانہ اور پسندیدہ اقدار سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس سازش کی کامیابی کے نتیجہ میں ہماری مذہبی زندگی کا ہر مظہر بے رنگ و بے آب ہو کر رہا گیا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی کا خیال ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ تصور نافذ کر دیا گیا ہے کہ ہمارے تمام تر مذہبی اور خالصتاً دینی وظائف اگر روکھے سوکھے قدیم طرز کے مطابق ہوں گے تو باعث ثواب دارین ہوں گے بصورتِ دیگر ہم موردِ عذاب ہوں گے، اس لئے کہ ہر مظہر حسنِ مظہر بدعت بھی ہے۔ مذہب کے اس ناقص تصور نے نوجوانوں کے دلوں میں اس کی منزلت گھٹا دی ہے۔

ڈاکٹر شریعتی اس معاملے میں بھی کلیتاً اقبال کے ہم خیال ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کسی ایسے فن کو قدر کی نگاہ میں نہیں۔ جو خود زندگی سے ہی برگشتہ ہو، اور ادب برائے ادب کا نعرہ ایک صریح لغویت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک غیر ذمہ دار شعراء اور فنکار کی حیثیت کذب گو جماعت کی ہے جو صرف دعوے میں یقین رکھتے ہیں اور عملی زندگی سے کوسوں دور ہیں۔ یہاں ڈاکٹر علی شریعتی نے بھی اقبال کی مانند اسوۂ رسولؐ کا حوالہ دیا ہے کہ آپ نے حسّان بنِ ثابت اور زہیر کے کلام کو پسند فرمایا، اس لئے کہ ان کے تخیلات میں سمیّت نہی تھی، وہ دین کے سچے خادم اور پیرو تھے، فنِ شعر کا اعلیٰ اور ارفع ذوق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر شریعتی فرماتے ہیں کہ حسّان بنِ ثابت حضورؐ کے ان صحابہ میں تھے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ بڑی کامیابی کے ساتھ ظلم اور جبر، جہالت اور تنگ نظری،

فسق و فجور، منکرات اور حیوانی و اسفل جذبات کے خلاف جہاد کیا، ان مجاہدینِ اسلام کے شانہ بہ شانہ جو واقعاً میدانِ کارزار میں اپنی فولادی تیغوں سے حق کی بلندی و سرفرازی کیلئے جہاد فی سبیل اللہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شریعتی فرماتے ہیں کہ جو زہر دورِ جاہلی کے مشاعروں نے عوام کی شریانوں میں سرایت کر دئے تھے ان کا ازالہ سعد ابن ابی وقاص جیسے جواں مرد مجاہد اسلام کی تیغ سے بھی ممکن نہ تھا۔ اس مقصد کیلئے تو حسّان جیسے عظیم شاعر ہی کی ضرورت تھی جنہوں نے فن کے عربوں اور زورِ تخیل سے ہی شعبدہ بازوں کو چت کیا۔ غلیظ اور ناپاک تخیل کے بالمقابل ایک صحت مند اور امید افزا زندگی کے خواب دکھائے۔ ڈاکٹر علی شریعتی اس تاریخی مثال سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر ہمیں موجودہ ماحول میں کامیابی کے ساتھ اپنے دینی اور ایمانی موقف کی وضاحت کرنی ہے، اگر ہمیں اپنے دین کی ترویج و اشاعت کے عظیم مشن سے وابستہ رہنا ہے تو ہمیں کھوئی ہوئی اور سردست زنگ آلودہ ادبی و فنی میراث کی جستجو کرنی ہوگی، اس کے بغیر ہم اپنی تمام کوششوں کے باوجود عہد جدید کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر شریعتی کا کہنا ہے کہ اسلام بحیثیت ایک ضابطۂ زندگی، تہذیب اور ثقافت کے ادبی، فنی اور جمالیاتی اقدار کی حرمت کا ہمیشہ سے قائل رہا ہے۔ رب کائنات جو بذاتہ حسن مطلق ہے۔ خوبصورتی کو اس درجہ پسند کرتا ہے کہ اکثر اس نے قرآن پاک میں خوبصورتی کی قسم کھائی ہے، خدا کا قرآن وہ صحیفۂ آسمانی ہے جو جلال و جمال کی آمیزش کا عظیم مظہر ہے۔ تمام نبیوں کو خدا نے کچھ معجزات ودیعت کئے تھے لیکن حضورِ کائنات ﷺ کو معجزۂ قرآن کی شکل میں عطا ہوا جو ربانی اسلوب کا حامل ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی فن کے ایجابی و سلبی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو زندگی کو سنوارنے کی بھی اپنے اندر بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے اور برباد کرنے پر بھی قادر ہے، اس میڈیم سے دونوں ہی طرح کے کام لئے جا رہے ہیں، ذلیل اور کمین افراد نے اس کو۔۔۔ اپنے حقیر اور اسفل مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور حق

پرست اور خداترس انسانوں نے اسے عطیۂ ایزدی سمجھ کر چشم و گوش کی بیداری کے ساتھ محض اعلیٰ اور عظیم انسانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر شریعتی ہمعصر زندگی کی ہوش ربائی کے پس پشت بھی ادب وفن ہی کی جلوہ نمائی محسوس کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے عہد میں فن اور ادب کے لامحدود امکانات سے استفادہ کا رجحان روز افزوں ہوتا جاتا ہے، اس غیر معمولی موثر قوت کے ادراک نے جدید دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے، حد یہ ہے کہ ہوشیار اور چالاک لوگوں نے اپنی کوششوں سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ڈانڈے بھی اب فن اور ادب سے ملا دئے ہیں، زندگی کا کونسا ایسا گوشہ اور کون سا ایسا پیشہ ہے جس کی شاہراہیں اس سمت سے نہ گزرتی ہوں، افسوس تو اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ وسائل آج جن کے قبضہ اور دسترس میں ہیں، وہ بیشتر دشمنِ آدمیت اور ننگِ انسانیت ہیں، ان کے طاغوتی منصوبے اس کے ماسوا کچھ نہیں ہیں کہ خدا کی اس سرزمین پر صرف درندگی پرورش پاتی رہے، اخلاقی نراج معصیت اور قانون تشفی کا ہی مذہب پروان چڑھتا رہے۔

ان ناگفتہ بہ صورت حال کے پیش نظر جدید دنیا میں امت مسلمہ کے کیا فرائض ہیں، عالمگیر فتنہ وشر سے پیدا ہونے والی عفونت اور غلاظت جو باقی ماندہ دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے پر آمادہ ہے۔ اس سے نوعِ بشر کو بچانے کیلئے اس سیلاب بلا کے آگے بند ھ باندھنے کیلئے ہمیں جو جتن کرنے ہیں، کیا ہم ان کیلئے تیار ہیں؟ اپنے اندر ہمت پاتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو شہیدِ اسلام ڈاکٹر علی شریعتی امتِ محمدی کے نوجوانوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا ہوگا، کیسے کرنا ہوگا، اس کا عملی اور اسلامی منصوبہ بندی کسی طرح ہو سکے گی، اس کی نشاندہی ڈاکٹر علی شریعتی خود کرتے ہیں اس سلسلہ میں وہ اپنی مذکورہ کتاب کے مضمون میں بھرپور اور مکمل نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس پورے نقشے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کا کوئی پہلو کوئی نکتہ موصوف کی توجہ سے اوجھل نہیں ہو سکا ہے، انہوں نے شعروادب کے علاوہ آرٹ اور فن کے وہ جملہ

اسالیب جو کسی نوع سے بھی رابطۂ عامہ میں معاون ہو سکتے ہیں، اظہار و ابلاغ سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے علمی منصوبے میں شامل کرلیا، جس میں کپڑے کی صنعت سازی، شہری منصوبہ بندی، ڈرامہ اور فلم سب کچھ شامل ہے، اس بات پر جس قدر خوشی ظاہر کی جائے کم ہے کہ ڈاکٹر شریعتی کے مخاطب صحیح اسلام پسند نوجوانانِ ایران نے موصوف کے بنائے اور پیش کردہ خاکے میں جس طرح رنگ بھرا ہے یقیناً یہ قدم اسلامی زندگی، اسلامی فنونِ لطیفہ اور مجموعی طور پر اسلامی ادبی و تہذیبی اقدار کی بحالی، فروغ اور تحفظ کیلئے ایک عظیم جست کے مصداق ہے۔

مرزا عارفؔ بیگ

داؤد ثانی حضرت اقبال

آپ پر اللہ کی رحمت ہو اور ہمارا اسلام

طلبم نہایت عشق کہ نہایتے ندارد
بنگاہِ نا شکیبے بہ دلِ امیدوارے

یہ جانتے ہوئے کہ عشق کی کہیں انتہا نہیں۔ حضرت اقبال اپنی آرزو کو دعا کی صورت میں حضور رب العزت میں پیش کرتے ہیں۔ اور اس بے حد و بیکراں سمندر کو پار کرنیکی توفیق طلب کرتے ہیں۔

آپ خوب سمجھتے ہیں کہ کسی بشر کی ذاتی جستجو کے ہوتے ہوئے اور انتہائی کاوشوں کے باوجود اس ''بسے دور دراز منزل عشق'' کو طے کرنے کے لئے فضلِ ایزدی کا شامل ہونا از بس ضروری ہے۔ اور اس میں کامیابی کے لئے۔ اس فیضان کیلئے بندہ کا منتخب ہونا لازمی ہے۔

جنونِ عشق کی اس سرحد پر وارد ہو کر عاشق کے جذب و شوق کی کیفیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہر قدم جو راہِ عشق میں اُٹھتا ہے۔ عاشق کو معشوق کی گلی کے قریب تر کرتا ہے۔ اور بالآخر اس کو وہاں پہنچا دیتا ہے۔

عشقِ شور انگریز را ہر جادہ در کوے تو برد
بر تلاشِ خود چہ مے ناز دکہ رہ سوئے تو برد

یقیناً جب عاشق جنونِ عشق کی انتہائی حد کو پہنچ جاتا ہے وہ اپنے راستے پر ڈال دیا گیا ہوتا ہے۔ جو اس کو خود بہ خود منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اس طرح سے نہایت عشق، منزل

مقصود وصل حقیقی پر پہنچنے کیلئے عاشق کی اپنی جستجو۔ اپنی کسی کاوش پر ناز کرنا بیجا ہے۔ مسافر عشق کو اس انعام کا مستحق سمجھتا جاتا ہے۔ اور اس کو قربِ دوست کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ سالکِ راہ نے اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پالینے کے راز کو پالیا ہو۔ اس کی آنکھیں سوئے الی اللہ پھر گئی ہوں اور ماسوااللہ سے بے تعلق ہوگئی ہوں۔

اس محویت اور اس قلبی جاذبیت کو ایک کشمیری بزرگ نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے کہ

وٹہ کھے چشمتہ رٹہ کھے دم

ادہ ہو سپدکھ وتہ محرم

(اے عاشق باللہ اگر تو اپنی آنکھیں کو بند کر کے سانس کو بھی بند کرے اپنی ساری توجہ محبوب حقیقی کی جانب پھیر لے۔ تو یقیناً تجھے اس راستہ پر ڈال دیا جائے گا جو تجھے اس کے کوچے میں پہنچا دیگا)

حضرت اقبال کی اس تصویر پر نظر ڈالئے جسمیں وہ آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کے سہارے اسی محویت کے عالم میں مستغرق ہیں جہاں انہیں اپنی من کی دنیا کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا ہے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ آپ کسی شعر کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ حضرت اقبال مردِ قلندر تھے۔ شعرا کے جذب دروں کا اظہار کا ذریعہ تھا۔ آپ محو باللہ تھے۔ نظر کے مقام سے بالاتر ہو کر دلِ باخبر کے متمنی تھے۔

یارب درون سینہ دلِ باخبر بدہ

در بادہ نشہ را نگرم آن نظر بدہ

یہ مقام منتخب بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہاں بندے کو رازہائے گوناگوں سے دو طرح سے باخبر رکھا جاتا ہے۔ یا دل آگاہ کو ناگاہ تجلی سے مشرف کیا جاتا ہے۔ یا کسی فرشتے کے ذریعے باخبر کیا جاتا ہے۔ یہ خاصانِ حق کا مقام ہے۔ اولیاءاللہ کبار کو اس شرف سے نوازا جاتا ہے۔

اس مقام پر فائز ہو کر حضرت اقبال اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ:

زبرون در گزشتم ز درون خانہ گفتم
سخنے نگفتۂ راچہ قلندرانہ گفتم

کہتے ہیں میں نے کائنات اور ماورا کی سیر کی۔ ہر شے کا جائزہ لیا۔ مگر میں اب عشق کے محل میں داخل ہو گیا ہوں۔ آپ کو اس گھر کے اندر کی باتیں سنا رہا ہوں۔ ایسی باتیں جو آج تک پردۂ راز میں رہی ہیں۔ میں انہیں قلندرانہ انداز میں ظاہر کر رہا ہوں۔ خدا سے ایسا دل طلب کر یہ کلام سمجھ سکو گے۔

حضرت اقبال مقام شناس ہیں۔ خود آگاہ ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ وہی منزل ہے جہاں پر بنی اسرائیل کے ایک ممتاز نبی حضرت داؤد علیہ السلام فائز تھے۔ محسوس کرتے ہیں کہ حضرت موصوف کی طرح مجھ کو بھی ویسے ہی جذب وشوق اور اُنہی ترنم آفرین نغموں سے نوازا گیا۔ اس لئے اللہ سے درخواست کرتے ہیں:

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز
ہر ذرۂ مرا پر وبال شرربدہ

اے بندہ نواز! مجھے بھی تو دل باخبر سے نوازا جائے۔ میرے کلام کو بھی وہی شہرت دوام عطا کر جو ترنم داؤد کو عطا فرمائی ہے۔ اس میں بھی وہی تاثیر پیدا کر وہی دشت وجبل کر وہی چرند وپرند کو محصور کرنے کی خاصیت عطا کر جو نغمہ داؤد کو مرحمت فرمائی تھی۔

دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

بارگاہِ ایزدی میں دعائے اقبال کو قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔

بے شک حضرت داؤدؑ کی طرح آپ بھی (نعم البدل) خوبیوں کے مالک اور (آداب) اللہ کی جانب کثرت سے رجوع کرنے والے تھے۔ بندہ اسی لئے سنت اللہ کے مطابق انا کذلك نجزی المحسنین کا امرِ الٰہی آپ پر بھی نافذ ہوا۔ اور آپ بھی اللہ کے نیکوکار بندوں کی طرح لافانی شہرت کے انعام سے مشرف ہو گئے۔

پروفیسر مرغوب بانہالی

اقبال اور رواداری کا نظریہ

علامہ اقبال کی شخصیت بیسویں صدی کی ایک ایسی عبقری اور کثیر الجہات شخصیت واقع ہوئی ہے، جس کو اپنے چند امتیازات کی بناء پر شاعرِ مشرق تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایک انوکھی شان والے شاعر کی حیثیت سے خاص آئیڈیل ازم اور خاص پریگمیٹ از کی ترجمانی کرنے والے اس فلسفی شاعر نے بہ یک وقت رومیؔ و حالیؔ کا وارث جائز ہونے کا فرض بھی نبھایا ہے اور حافظؔ و غالبؔ کی فنکاری کو بھی ارتقاء آشنا بنادیا ہے۔ اور یوں وہ دبستان مشرق کا ایک ایسا جینیس یا نابغہ بن کر اُبھرا ہے جس کو ہم بجا طور پر اپنے آسمان کا روشن ترین اور قریب ترین ستارہ قرار دے سکتے ہیں۔

یہ بات سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی برصغیر کے ایسے پہلے اور اب تک آخری فلسفی شاعر ہیں جن کی قومی دردمندی، شعورِ ملی، انسان دوستی اور عالمگیر شہرت کے جذبات سے معمور شاعری پر دنیا میں سب سے زیادہ اظہار کیا گیا ہے اور جن کے جدتِ اظہار اور ندرت افکار کی طرف مشرق سے پہلے مغرب نے توجہ کی ہے۔ آج بھی دنیا کے بیشتر ملکوں میں آپ کے فکر انگیز کلام پر آئے دن مزید اظہار خیال کئے جانے کی ضرورت برابر محسوس کی جارہی ہے۔ کلامِ اقبال کے تئیں اسی روز افزوں عالمی توجہ کے تناظر میں بیسویں صدی کے ممتاز ایرانی شاعری آقای ملک الشعراء بہارؔ بے احتیاطی کہہ اٹھے ہیں ؎

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت واحدے کز صد ہزاران برگزشت

یعنی یہ کہ موجودہ صدی عظیم شعر و ادب کی نئی رفعتوں کے حوالے سے شاعر مشرق

اقبال کی صدی بن گئی ہے کیونکہ اس کی منفرد آواز لاکھوں شاعروں کی آوازوں سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ اور یہ آفاقی اپیل والی آواز رنگ و نسل یا ملک و مسلک جیسے تعصّبات پر غالب آجانے کے آداب سکھانے کے ناطے ہر اقلیم کی عقل سلیم پر چھا گئی ہے۔ ایرانی ملک الشعراء کے اس مبنی بر صداقت خراجِ عقیدت کی صدائے بازگشت مراکش کے ممتاز دانشور پروفیسر ایس اے فہد کے ان الفاظ میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔

''اقبال ایک ہمہ گیر عالمی شہرت کے شاعر ہیں۔ آپ کی ہمدردیاں اتنی وسیع ہیں کہ اُن میں تمام دنیا کے انسان بلا امتیازِ نسل و ملک سما سکتے ہیں۔ آپ عظمت انسانی کے علمبردار ہیں۔ اس لئے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے''

ہمسایہ ملک سری لنکا کے ایک ممتاز اقبال شناس دانشور ریتسا وجے رتنا شیعہ مسلک سے وابستہ مذکورہ بالا ایرانی ملک الشعرا اور مالکی مسلک سے وابستہ مراکشی پروفیسر کے ساتھ اعترافِ حقیقت کرنے میں بدھ مت سے وابستہ ہونے کے باوجود ہم آواز دکھائی دیتے ہیں۔ جب وہ لکھتے ہیں:

''یہی وہ پیغام تھا جس کی انسان دوستی نے اقبال کی شاعرانہ کشش کو عالمگیر بنا ڈالا، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفلِ سخن گرم ہو، خواہ وہ مسلم پاکستان ہو یا ہندو بنگال، ایران ہو یا روس کی کوئی اسلامی جمہوریہ، چین ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کے مسیحی طلباء کا اجتماع یا بدھ طالب علموں کی کوئی ایسی ہی محفل، ہر جگہ اس کے نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنہیں اسلامی احیاء کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے''[۳]

یہ بات ذہن میں رہے کہ کلامِ اقبال کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا بے لاگ تبصرہ کرنے والے مشرقی ملکوں کے درجنوں عالموں سے پہلے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' نام کی پالیسی والے یورپ کے ملکوں سے وابستہ ممتاز اسکالروں نے بہت پہلے کلامِ اقبال

میں پائی جانے والی رواداری، انسان دوستی اور آفاقی اپیل کی امتیازی تاثیر کو محسوس کرلیا تھا۔ بلکہ اسی وقت سے جب ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی علامہ اقبال کی اسرارِ خودی نامی پہلی شعری تصنیف کا ترجمہ مشہور مستشرق پروفیسر آر۔اے نکلسن نے ۱۹۲۰ء کے دوران انگریزی میں اس تمہید کے ساتھ پیش کیا تھا:

''جہاں منطق ناکام ہوتی ہے وہاں اقبال کا کلام ذہن کو جلا بخشتا ہے اور قائل کرتا ہے۔ اُس کا شاعرانہ پیغام محض ہندی مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اقبال نے عالمِ اسلام کو مخاطب کیا ہے اس لئے وہ ہندوستانی زبانوں کے بجائے فارسی میں دادِ سخن وری دیتا ہے۔ اظہار کے لئے فارسی کا انتخاب اس بناء پر خوشگوار ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان فارسی زبان و ادب سے مانوس ہیں۔ فارسی فلسفیانہ خیالات کے لئے موزون بھی ہے اور دلکش بھی''[۴]

پروفیسر نکلسن کے ایک اور مغربی ہم عصر ای۔ایم۔فارسٹر کا ایک چھوٹا سا اقتباس درج کرنا بھی یہ حقیقت صحیح ڈھنگ سے پہچاننے کے لئے مفید رہے گا کہ انسان دوستی، رواداری اور احترامِ آدمیت کی انتہائی زوردار وکالت کرنے والے کلامِ اقبال سے متعلق مختلف بدگمانیاں مختلف سطحوں کے غیر مسلموں میں پھیلانے کا سلسلہ کیونکر اور کہاں سے شروع کیا گیا تھا۔ فارسٹر کے ۱۹۲۰ء میں تحریر کردہ اقتباس کا ترجمہ یہ ہے:

''ہندوؤں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے وہی مسلمانوں میں اقبال کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے۔ اس لئے کہ ٹیگور کو بنگال کے باہر اُس وقت کسی نے نہ پوچھا جب تک وہ یورپ جا کر نوبل پرائز نہ حاصل کر لائے۔ بخلاف اس کے اقبال کی شہرت و ناموری یورپ کی ایسی کسی امداد کے زیرِ بارِ احسان نہیں ہے۔ لاہور و دہلی، علی گڈھ، لکھنو، بھوپال و حیدرآباد، سب اقبال کی رفعتِ افکار اور شاعرانہ عظمت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ کیا لندن بھی

اس فتوی پر مہر تصدیق لگائے گا؟''[۵]

مغربی دانشوروں کے دونوں اقتباسوں کو بین السطور پڑھ لینے اور ان کی زیریں لہر میں چھپی دانشِ مغرب کی فتنہ انگیزی کی اصلیت تک پہنچنے میں دوسرے اقتباس کا آخری سوالیہ جملہ بہت معنی خیز ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ لوگوں کو نوبل پرائز سے نوازنے میں کارفرما رہنے والی سیاسی مصلحتوں کی جانب سے اس میں واضح اشارہ موجود ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ برصغیر کی دو سب سے بڑی اکثریتوں کو آپس میں دست و گریبان رکھنے کے لئے خواص کی سطح پر کعبہ اور بتخانہ کے علاوہ اقبال اور ٹیگور جیسے ناموں کا بھی بھرپور استحصال ہوسکتا تھا۔ البتہ عوام کی سطح پر گائے کے گوشت اور سور کے گوشت کا نام لے لے کر بھی جذبات کو برانگیختہ کیا جاسکتا تھا۔ پشتِ مار کی طرح خوشنما دکھائی دینے والی ایسی درجنوں مغربی نگارشات میں چھایا گیا زہر دیر سویر اپنا اثر دکھاتا رہا اور برصغیر تقسیم ہوجانے کے بعد ایک انسان دوست شاعر کو محض پاکستانی قومی شاعر اور دوسرے کو محض ہندوستانی قومی شاعر بنا کر پیش کرنے سے فتنہ پردازوں کا کام بہت آسان بن گیا اور بقول غالب۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

افرنگی ہندوؤں کے دوست بن کر اُن کے ذہنوں سے وقتی طور پر وہ سب نقوش مٹانے میں کامیاب ہوگئے جو ہر کسی مصلحت سے بالاتر ہوکر علامہ اقبال کی رواداری سے معمور ایسے مخلصانہ اشعار نے گزشتہ دہائیوں کے دوران اُن پر قائم کئے تھے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کا
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

حقیقی رواداری جس آپسی محبت، حسن سلوک، وسعت دلی اور قوت برداشت کی متقاضی ہوتی ہے اُس کا اعلیٰ ترین معیار بانگ درا کے شاعر نے خاص درسِ محبت دینے والے ایسے اشعار میں قائم کیا ہے:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

محبت کے شجر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

سب سے بڑا المیہ اور مقامِ تعجب یہ ہے کہ ''اُردو'' خصوصیت کے ساتھ پڑھنے والے مسلموں کی ذہنی تربیت ایسے اشعار سے کرنے والے شاعر مشرق نے غیر مسلموں کے ''رام'' اور ''نانک'' جیسے مذہبی پیشرؤوں کے جو مدحیہ اشعار بے لوث جذبے کے تحت لکھے تھے، غلط فہمیوں کے ایک عبوری دور میں اُن کی ایسی دلنوازی کو بھی نظر انداز کیا گیا:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

چستی نے جس زمین میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہمارے معاصرین میں شامل ایک اہم نقاد اور اقبال شناس ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کی روشن رواداری کے ایسے درخشندہ آثار و اشعار کو نظر انداز کئے جانے اور مسلمانوں کی

حالت زار پر کڑنے والے اشعار کی تاویلات توڑ مروڑ کر پیش کرنے والے معترضین کی نشاندہی ان غور طلب الفاظ میں کی ہے:

''اقبال پر وقتاً فوقتاً جو اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ اُن کی بناء پر اپنی زندگی ہی میں اقبال کو کم نظر مسلمان، محدود اسلامی فلسفے کا حامل، تصوف نا آشنا، حافظ دشمن فاشسٹ، مارکسسٹ اور بیک وقت لینن و مسولینی کا پجاری قرار دیا جاتا رہا۔ واضح رہے کہ متضاد نوعیت کے یہ الزامات کسی ایک نقاد یا مکتبہ فکر کے حامل افراد کی جانب سے نہ لگائے گئے بلکہ مختلف اوقات میں مخصوص مقاصد کے تحت ایسا کیا جاتا رہا۔ اور حسبِ ضرورت یا مخصوص سیاسی حالات کی بناء پر کبھی یہ الزامات ہیں، تو کبھی تمغۂ امتیاز''[۶]

اقبال کی بے لوث رواداری، دلنوازی اور بے تعصبی کو جہاں اُن کے ہم مذہبوں نے کئی طرح سے آڑے ہاتھوں لیا وہاں غیر مسلموں میں سے بیشتر لوگوں نے شاعر کے ان اوصافِ جمیلہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور انسانوں کے اس عظیم دردمند ترجمان کو یوں ایسے خون کے آنسو بہانے کی نوبت بھی آن پہنچی۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین وحق اندیش خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر کو یہ ڈر ہے کہ مسلمان ہوں میں

میری نوائے شوق سے شورِ حریم ذات میں غلغلہ ہائے الامان بتکدۂ صفات میں
جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیط آبِ گنگا تو مجھے
سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

کلامِ اقبال کی داخلی شہادت قدم قدم پر یہ بات محسوس کراتی ہے کہ سراپا خلوص شاعر

اگر کسی سے دلی نفرت اور عناد رکھتے تھے تو وہ رواداری کی بیخ کنی پر آمادہ عناصر تھے خواہ اُن کا تعلق مسلمانوں سے ہوتا تھا یا ہندوؤں سے۔ چنانچہ اقبال عمر بھر ایسے عناصر میں شامل واعظ اور برہمن کو ایک ہی طرح کی شدتِ جذبات سے ہدفِ تنقید بناتے رہے مثلاً ایسے اشعار میں واعظ متعصب کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے۔

عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب — عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
خوار ہوا کس قدر آدمِ یزدان صفات — کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انسان کی رات
تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ — کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ
طلسم بیخبری کافری و دینداری — حدیث شیخ و برہمن فسون و افسانہ
غریب شہر ہوں سن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے میری محبت کو محبتِ فرہاد

اسی طرح رواداری کی بیخ کنی کرنے والے تنگ دل برہمن کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے۔

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — پنکھڑوں کو پھر ملائیں نقش دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے — دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
آہ شودر کے لئے ہندوستان غم خانہ ہے — دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

شودر کے دُکھوں کی کسک محسوس کرنے والا شاعر دردمندی کا عرفان بانٹنے کے لئے ہندوانہ اصطلاحوں کو بروئے کار لا کر فنِ شعر کے خاص شعر کے خاص ابلاغی اور تاثیری اقدام کو اپناتا ہے۔ اور یوں ملکی یا لسانی تعصب کو پامال کرنے کا یہی حوصلہ مندانہ اقدام ایک روایت سازی کا فریضہ بن کر نکھرتا ہے۔ اقبال جیسے پاکباز انہ جذبات والے اور مومنانہ خیالات والے شاعر کے لئے رواداری کو موضوعِ سخن بنانا کسی عارضی یا سطحی میلان کا تقاضا

نہ تھا بلکہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے ایسا سوچنا اور دوسروں کو اس کا عرفان بخشنا اس کا جزو ایمان تھا کیونکہ وہ ایک انتہائی عبوری دور سے گزر رہے برصغیر کے ممتاز اسلام شناس دانشوروں اور شاعروں میں شامل ہونے کے ناطے قرآنِ حکیم کے ایسے واضح ارشادات کا دل سے قائل اور عامل تھا جن میں خود اللہ نے اپنے رسول کو رواداری سکھائی ہے یوں:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿١﴾ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ا

اے میرے رسول کہہ دیجئے منکروں سے میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو

وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ

اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں اور نہ مجھ کو پوجنا ہے جس کو تم نے پوجا

وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ

اور نہ تم کو پوجنا ہے جس کو میں پوجوں۔ تم کو تمہارا دین مجھ کو میرا دین

لااِکرٰہ فی الدین۔ قدتبین الرشد من الغی (البقرہ)

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں بے شک ہدایت گمراہی سے جداگانہ ہے

اقبال کی رواداری کے واضح تصور کا یہی وہ روحانی پس منظر ہے جس نے اعتراض برائے اعتراض کرنے والوں کی تلخ نوائی اور دل آزار الزام تراشی کے مقابلے میں بھی آپ کے پائے استقلال میں ڈگمگاہٹ پیدا نہ ہونے دی۔ چنانچہ اسی اتھل پتھل کی گرم بازاری کے دنوں میں چند مفاد خصوصی رکھنے والوں نے تمام کردار کشیوں کی زور آزمائی کے باوجود اقبال جیسے رواداری کے علمبردار کو غلط رنگ میں رنگنے کی چنداں کامیابی نہ پائی ماسوائے اس ایک بات کو ہر سطح پر اُچھالنے کے کہ اقبال ہی نظریۂ پاکستان کا بنیادی محرک رہا ہے اور اسی نے گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک ایک الگ وطن کا مطالبہ تشکیل دیا تھا۔ اس طرح کا سطحی اظہار کرنے والے ان سیاسی اور معاشی عوام کو یکسر انداز کرتے ہیں

جو فتنہ پرور فرنگیوں کی پشت پناہی اور آشیرواد سے اس وقت کے (چند متعصب غیر مسلموں) کے ذریعے بروئے کار لائے جا رہے تھے اور مسلم دانشوروں کے لئے کوئی چارہ باقی نہ رہ دینے کی حد تک ان کی آزمودہ وطن دوستی کو مشکوک بنانے اور ان کو وطن سے نکلنے پر مجبور کرنے کی ریشہ دوانیاں اپنی انتہا کو پہنچائی جا رہی تھیں۔ نہ صرف ان کی عزتِ نفس اور وسائل روزگار پر طرح طرح کے حملے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ بلکہ وطن دوستی، رواداری اور انسانی بھائی چارے کے شیرین ترین نغمے گانے والے اقبال جیسے محبِّ وطن کی خلوص بھری نگارشات کو شجر ممنوعہ بنانے کے عملی اقدام بھی بڑی ڈھٹائی سے کئے جاتے تھے یہاں تک کہ اس کا ذریعہ اظہار رہی ہوئی اُردو زبان بھی معتوب قرار پائی۔ اس قسم کی صورت حالات میں اقبال کا کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا رواداری کا وہ روشن تصور بھی تعصب کے ابرِ نحوست کی لپیٹ میں آ گیا جس کی بنیاد اس نے مہاراجہ کشن پرشاد جیسے بے تعصب ہندو قدردان کے ساتھ مخلصانہ خط و کتابت کر کے ڈالی تھی چنانچہ منجملہ اور باتوں کے پرشاد جی موصوف سے رواداری پر مبنی خاص طرح کی راز و نیاز والی باتیں بھی ایک عرصہ تک کرتے رہے تھے مثلاً سوامی تیرتھ کو مخاطب کر کے کہے گئے ایسے شعر کے حوالے سے۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو　　پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تو

خصوصاً گا تیری کے منظوم ترجمہ پر مبنی ایسے اشعار کے حوالے سے:

اے آفتاب! روح وردان جہاں ہے تو　　شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو
قائم ہے عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے　　ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے　　چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

چنانچہ ۱۱، اکتوبر ۱۹۲۱ء کے روز کشن پرشاد موصوف کے نام لکھے گئے لمبے خط میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''سرکار نے میرا ترجمہ ''گا تیری'' پسند فرمایا۔ میرے لئے یہ بات سرمایہ فخر و امتیاز ہے۔ افسوس کہ سنسکرت الفاظ کی موسیقیت اُردو زبان میں منتقل

نہیں ہوسکتی۔ بہر حال غالباً اصل کا مفہوم اس (ترجمے) میں آگیا ہے۔ زمانے نے مساعدت کی تو "گیتا" کا اُردو ترجمہ کرنے کا قصد ہے۔ فیضی کا فارسی ترجمہ تو حضور کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ فیضی کے کمال میں کس کو شک ہوسکتا ہے مگر اس ترجمے میں اس نے گیتا کے مضامین اور اس کے اندازِ بیان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں کیا۔ بلکہ میرا تو یقین ہے کہ فیضی "گیتا" کی روح سے نا آشنا رہا"[22]

اسی کو کہتے ہیں علم و عرفان کے معاملے میں دل اور ذہن کے دریچے کھلے رہنا جس کا عملی ثبوت علامہ اقبال نے مغربی فلسفہ و علوم کا مطالعہ کرتے ہوئے یورپ میں بھی دیا ہے اور مقامی سطح پر اپنے وطنِ عزیز میں قیام کے دوران بھی۔ درج بالا حقائق کی روشنی میں جو خاص لمحہ فکریہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رواداری کا مجسمہ بن کر جو وسیع دل اقبال بحیثیت ایک انسان دوست اہل قلم "گیتا" اور "گرنتھ صاحب" کے عرفانِ وحدت کی بات اس قدر کھل کر بیان کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا ہے وہی اس ایک بات کے لئے کیونکر صرف مسلمانوں کا شاعر ٹھہرایا جائے گا کہ اس نے کلام اللہ اور قرآنی ارشادات کے عرفانی نور سے فیض یاب ہونے کی فنکارانہ دعوت کو اپنے شعری پیغام کا حصہ بنالیا ہے۔ اور مشرق کے سنائیؔ، رومیؔ، عطار اور سعدیؔ جیسے عظیم شاعروں کی طرح اقبال نے بھی اگر اسلامی تعلیمات کا جوہر عالم انسانیت کی بہبودی کے لئے اپنے کلام کا جوہر بنالیا ہے تو کیا وہ بجائے خود خیر خواہی رواداری اور عالم آرائی کے جذبوں کا عکاس عمل نہیں لگتا۔ میں اس نکتے کی طرف اپنے فاضل قارئین کی توجہ حفظ اقبال یا عذر خواہی کے کسی جذبے کے تحت مبذول نہیں کرارہا ہوں بلکہ فقط یہ مخلصانہ مشورہ دینے کے لئے کہ عہد ساز شخصیتوں کے افکار و اعمال کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں بھی اس طرح کا حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرلینا چاہیے جیسا بعض روشن فکر مغربی نقادوں نے تعصب چھوڑ کر کیا ہے۔ مثال کے طور پر زیر بحث اکتساب عرفان اور قرآن حکیم کے حوالے سے اپنی ناقدانہ رائے 'فکر اقبال کا تعارف' نام کی کتاب

میں بداہتاً پیش کرنیوالی فرانسیسی خانتو لوس کلودمیتر Luce Claude Maaitre لکھتی ہیں ''یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہواور وہ قرآنِ مجید سے اثرات قبول نہ کرے۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکرِ اقبال قرانِ مجید سے اخذ وقبول کرتا ہے اور نہیں تو کم از کم اس کی وسیع حدود کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے کہ شاعر قدم قدم پر قرآن حکیم سے استفادہ کرتا ہے چنانچہ اس کے کلام میں آیات کے جوہر بار بار حوالے ملتے ہیں تو اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اقبال ہر ممکن طور پر پیغمبرِ اسلامؐ کی متعین کردہ سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) سے انحراف نہیں کرنا چاہتا''[۸]

ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی سیدھی راہ روشن کرنے والے قرآن حکیم کے ساتھ علامہ اقبال کی گہری وابستگی کا یہی پہلو آخر کار ایم فارسٹر کی سمجھ میں آ گیا تھا، جبھی تو اس نے ۱۹۴۶ء میں پڑھے گئے ایک مقالے میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ:

> ''اقبال کٹر مسلمان تو تھا مگر وہ کہنہ روایات کا پرستار نہ تھا۔اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہو مگر وہ انتہا پسند متعصب نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں کا ہمیشہ ادب واحترام سے تذکرہ کیا''[۹]

ڈاکٹر شیلا میکڈونف نے ایک عمدہ نکتہ کچھ اس طرح سے اُبھارا ہے کہ اقبال کا کلام اگر کسی کو اپنے خلاف بہت کڑوی تنقید لگنا چاہیے تو وہ ہندو یا عیسائی نہیں بلکہ خود ننگِ اسلام بنے ہوئے مسلمان ہیں۔ موصوفہ لکھتی ہیں ''اگر میں ایک مغربی عیسائی کی حیثیت سے اپنے آپ سے پوچھوں کہ کس مقام پر اقبال مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ میں اسے واضح طور پر اور بے کم وکاست اس وقت سمجھ پاتی ہوں جب وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتا ہے..... جب اقبال کسی عیسائی پر نشتر زنی کرتے ہیں تو میں ان کے خنجر کی کاٹ کورگ جان پر محسوس کرتے ہوئے یہ اندازہ بخوبی کر سکتی ہوں کہ مسلمانوں پر ان کی ضرب کس قدر کاری ہوتی ہوگی..... وہ خوابیدہ مسلمان جنہیں اقبال نے اپنی تخلیقی کاوشوں کا مرکز

بنا رکھا ہے"[۱۰]

بہر حال جو اقبال اپنی اولین مثنوی میں مسلمان سامع کے دوش بدوش ہندو سامع کے ساتھ بھی کمالِ شفقت سے مخاطب ہوا تھا کہ:

من نگویم از بتان بیزار شو	میں نہیں کہتا کہ تو بتوں سے بیزار ہو جا
کافری شائستہ زنار شعر	اگر تو منکر بھی ہے تب بھی زنار پوشی کا حق ادا کرنیوالا بن
از گلے خود آدمے تعمیر کن	وہ یوں کہ اپنی بے سوز مٹی پر آدم گری اور انسان سازی کے نسخے آزما
بہر آدم عالمے تعمیر کن	اور یوں بنی نوع آدم کے لئے ایک نئی دنیا پیدا کر

وہی اقبال اپنی آخری اور شاہکار مثنوی جاوید نامہ میں مسلم شخصیتوں کا ذکر خیر کرتے وقت کمال سوز و مستی کے عالم میں پہنچ کر بھی مہاتما گوتم بدھ جیسے عارف ہندی اور بھرتری ہری جیسے ہندو شاعر کا ذکر خیر نہیں بھولتا۔ بلکہ پورے برصغیر کی یکساں بھلائی چاہنے والا اقبال جہاں بدھ کے حوالے سے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ تنگ دلی اختیار کرنے والے اہل ہند ناموس ہند کو داؤ پر لگا رہے ہیں ؎

شمعِ جان افسرد در فانوسِ ہند	ہندیان بیگانہ از ناموسِ ہند

وہاں وہ برسات کے بادل کی طرح فیض پہنچانے پر آمادہ شاعر بنا کر برتری ہری کو پیش کرتا ہے یوں ؎

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است	فطرتِ او چون سحابِ آذری است

بہر حال یہ ہیں علامہ اقبال کے بے ریا وسعت دلی، شاندار ملنساری، جاندار انسان دوستی اور عملی رواداری کے چند پہلو جو تین ہزار الفاظ سے متجاوز نہ ہونے کے مکلّف بنائے گئے اس مضمون میں سما سکتے تھے۔

☆

حوالہ جات

۱۔ علامہ اقبال کے اُردو و فارسی کلام کی داخلی شہادت (دونوں کلیاتوں کے متون کی صحت ملحوظ رکھ کر)

۲۔ ''ہمہ گیر شہری'' بحوالہ تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۸۶۸۔

۳۔ ''عالم گیر انسانیت کا شاعر'' از تیسا وجے رتنا (Tisa Vijay Ratna)

۴۔ اسرار خودی کے انگریزی ترجمے کا پیش لفظ از پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن۔

۵۔ ''خودی کا ترجمان'' از ای۔ایم۔فارسٹر

۶۔ تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید از ڈاکٹر سلیم اختر، ص ۸۶۵۔

۷۔ کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی، جلد ۲، ص ۲۸۲۔

۸۔ Introduction to the Thought of Iqbal, P.27

۹۔ Two Cheers for Democracy

۱۰۔ The Mosque of Cardova (Qartaba) Vision or Perish

محمد بدیع الزماں

اقبال کے کلام میں ''حیدرؓ'' اور اس سے وضع کی گئیں اصطلاحیں

(اسلامی تاریخ کے پس منظر میں)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اقبال کی عقیدت مندی طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھی۔ چنانچہ جب اقبال لاہور کے مقامی کالج میں طالب علم تھے تو اُن کی محلّہ کے ایک مولوی صاحب نے مشہور کر دیا کہ اقبال تو شیعہ عقیدہ کے دلدادہ ہیں۔ جب یہ بات بہت زیادہ پھیلی تو اقبال نے ۲۷ اشعار کی نظم ''زہد اور رندی'' لکھی جو ''بانگِ درا'' کے حصہ اول (۱۹۰۵ء تک) میں شامل ہے۔ اقبال نے اس نظم میں پہلے مولوی صاحب کی زبانی اپنے بارے میں یہ اشعار لکھے۔

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی

پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں رشکِ کلیم ہمدانی

ہے اُس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اُس کی زبانی

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں ؎

اس شہر میں جو بات ہو، اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی

اتفاق سے ایک دن سرِ راہ اقبال کی ملاقات ان مولوی صاحب سے ہوگئی۔ آگے اقبال کا جواب سنئے:

اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اُس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یہ تھی بہت صغرسنی سے حضرت علیؓ سے اقبال کی عقیدت مندی۔ صحابہ کرام رضی اللہ اجمعین میں اقبال کے کلام میں سب سے زیادہ اشعار حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپؓ کے القاب پر ہیں۔

اقبال کے فلسفہ میں عشق اور فقر خودی کی تربیت وتزئین کے لازمی اجزاء ہیں اور حضرت علیؓ میں اقبال کو ان دونوں کا حسین امتزاج نظر آیا اور اسی لئے اس معاملہ میں اُنہیں آئیڈیل بنا کر پیش کیا۔ عشق یعنی عشقِ رسولؐ سے گرویدگی کے معاملہ میں اقبال اپنے فارسی کلام ''اسرارِ خودی'' میں حضرت علیؓ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مسلم اول شہہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں، علیؓ

حضرت علیؓ کا نام اقبال نے صرف تین بار لیا ہے۔ پہلی بار تو ''بانگِ درا'' کی متذکرہ بالا نظم ''زہد اور رندی'' میں اور دوسری بار اسی مجموعہ کی نظم ''خضرِ راہ'' کی ذیلی نظم ''دنیائے اسلام'' کے دوسرے بند کے اس آخری شعر میں ؎

اے کہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اس شعر میں اقبال مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ تم کیوں اس اُلجھن میں رہتے ہو کہ حضرت ابوبکرؓ پہلے خلیفہ اور حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ میں افضل کون ہے کیونکہ اس طرح تم خفی یعنی فروعی باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہو بجائے اس کے کہ جلی یعنی واضح اصول میں اپنا وقت صرف کرد۔

حضرت علیؓ پر اقبال کے کلام میں تیسرا شعر ''بال جبریل'' کی درج ذیل رُباعی کا ہے۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اس رباعی میں اقبال نے عشق کا مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونا بتایا ہے۔ کبھی یہ عشق انسان کو بے خانماں کر دیتا ہے۔ جس طرح رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ لمبے عرصہ تک مکہ میں کفار کے ہاتھوں محصور رکھے گئے۔ اس عشق کے ظہور کی دوسری صورت سروری و سربلندی ہے اور کبھی یہ سرمایۂ محراب و منبر بن کر واردات عشق کا موضوع بن جاتا ہے۔ اور کبھی یہ ''مولا علی خیبر شکن'' کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے یعنی باطل کے مقابلہ میں اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جیسا حضرت علیؓ نے خیبر کی جنگ میں کیا جو رسول اللہؐ کی قیادت میں لڑی گئی۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب حضرت علیؓ کے نام اور لقب ''حیدرؓ'' اور اس سے وضع کی گئیں اصطلاحوں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

حیدر:

حیدر کے معنی شیر کے ہیں اور اقبال نے یہ اصطلاح اسی شعر سے لی ہے جسے حضرت سلمہ بن اکوعؓ نے روایت کی ہے کہ جب جنگِ خیبر میں حضرت علی خیبر کے یہودی سردار مرحب کے مقابلہ کو نکلتے تو یہ کہتے جاتے تھے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　کلبث غابات کریہ المنظرہ

او فیھم بالصاع کیل النسدرہ

ترجمہ: میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا ہے۔
جھاڑیوں کے شیر جیسا دیکھنے میں خوفناک ہوں۔ میں ان کو پورا بڑا صاع
ناپ دوں گا۔ جسے نسدرہ کی ناپ۔ یعنی میں ان کو قتل کر دوں گا۔

''حیدر'' کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ پہلا شعر ''بانگِ درا'' کی نظم ''طلوعِ اسلام'' کے چوتھے بند کا درج ذیل ہے۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقیر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

اس شعر میں ''زورِ حیدرؓ'' سے مراد حضرت علیؓ کی قوتِ ایمانی ہے۔ اس شعر میں دو صحابۂ کرام کا نام بھی آیا ہے۔ ابوذر غفاری صحابیوں میں کافی مشہور ہیں۔ اقبال نے حضرت سلمانؓ سے ''سلمانی'' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ حضرت سلمان فارسی ایرانی النسل تھے۔ اور ایمان لانے سے قبل آپ آتش پرست تھے۔

ایمان لانے کی وجہ کہ آپ پر مکہ کے کفار اور مشرکین کے ذریعہ ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان تفصیلی طور پر روایات میں آئی ہے۔ اقبال نے ''صدقِ سلمانی'' سے آپؓ کے ایمان کی پختگی و کردار میں روحِ محمدیؐ کے معنی مراد لیا ہے۔

''حیدرؓ'' کی اصطلاح سے دوسرا شعر ''بال جبریل'' کی درجِ ذیل رُباعی ہے جس میں ''بازوئے حیدرؓ'' سے اقبال کی مراد صرف جسمانی طاقت نہیں بلکہ وہ ایمانی طاقت ہے جو مشکل کو آسان کرتی اور باطل کے خلاف کامرانی عطا کرتی ہے۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اس رُباعی میں ''بازوئے حیدرؓ'' کو ''نانِ جویں'' سے مربوط کر کے اقبال نے یہ نکتہ

نکالا ہے کہ اگر عشقِ رسولؐ میں گرویدگی ہو تو حضرت علیؓ کی طرح نانِ جویں (جو کی روٹی) کھا کر ایک مومن خیبر شکن بن سکتا ہے نہ کہ لذتِ دینوی سے۔ اس رُباعی کے دوسرے شعر میں اقبال کمزور مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے خدا سے دعا گو ہیں کہ اُن کے بازوؤں میں بھی تو وہی طاقت عطا فرما جو تو نے یہی خوراک کھانے والے حضرت علیؓ کو عطا فرمائی تھی۔ اقبال نے یہاں ''بازوئے حیدرؓ'' کا ربط ''نانِ جویں'' سے ملایا ہے تو دوسری جگہ ''قوت حیدری'' کا ربط ''نانِ شعیر'' (غلہ کی روٹی) سے ملایا ہے جو شعر کے آگے ''حیدری'' کی اصطلاح کے تحت آ رہا ہے۔

''حیدرؓ'' کی اصطلاح سے تیسرا شعر بھی ''بال جبریل'' کی درج ذیل رُباعی کا ہے:

جمالِ عشق و مستی نے نوازی　　جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ　　زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

''ظرفِ حیدرؓ'' سے مراد حضرت علیؓ جیسی پختگی سیرت کا رنگ ہے۔ فرمایا ہے۔ ایک شانِ جمال جو عاشق کو بنی آدم کی خدمت پر آمادہ کرتی ہے۔ دوسرا شانِ جلال جہاں عاشق جو کچھ کرتا ہے خدا کی خوشنودی کے لئے کرتا ہے۔ تیسرا کمال جو جمال اور جلال کی عشق و مستی کی وجہ سے پیدا ہو کر ''ظرفِ حیدرؓ'' کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ چوتھا زوال جس سے مراد عشق و مستی کی صفات سے محروم ہو کر عاشق امام فخر الدین رازی بن جاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے اپنے فارسی کلام ''زبورِ عجم'' میں مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے:

من آں علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم　　کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را
بہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سودمند افتد　　بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراکِ رازی ما

حیدری: حیدری کے دو معنی ہیں (۱) منسوب بہ حیدر (۲) بہادر۔ اقبال نے اسے دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درجِ ذیل پانچ اشعار ہیں۔

حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہوکر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر

(بانگِ درا، جواب شکوہ، بارہواں بند)

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

(بانگ درا، میں اور تو، بعد از نظم ''شکسپیئر'')

عمارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟　　نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی

(بال جبریل، ایک نوجوان کے نام)

میرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

(ضربِ کلیم، جلال و جمال)

خدا نے اُس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری

(ضربِ کلیم، محراب گل افغان کے افکار، ۱۰)

پہلے شعر میں ''حیدری فقر'' سے مراد حضرت علیؓ کا شانِ فقر ہے۔ دوسرے میں ''قوت حیدری'' سے مراد ''بازوئے حیدرؓ''، یعنی جسمانی اور ایمانی طاقت ہے جسے اقبال نے یہاں ''نان شعیر'' سے مربوط کیا ہے۔ تیسرے شعر میں ''زورِ حیدری'' سے بھی یہی معنی مراد ہے چوتھے شعر میں ''زورِ حیدری'' سے مراد عشقِ رسولؐ میں گرویدگی کی بدولت خود میں روحانی طاقت پیدا کرنا ہے۔ پانچویں شعر میں ''حیدری'' کو فقر سے منسوب کر کے ''شکوہ سلطانی'' سے ربط قائم کیا گیا ہے۔

حیدر کرار:

اقبال نے ''کرار'' (جو لقب کہ حضرت علیؓ سے منسوب ہے) سے دو اصطلاحیں وضع

کی ہیں۔ایک ''حیدر کرار'' اور دوسری ''کراری''۔موخرالذکر پر روشنی اس اصطلاح کے بعد ڈالی جارہی ہے۔

''کرار'' کے معنی ہیں دشمن پر برابر حملہ کرتے رہنے کی شان۔یہ لقب حضرت علیؓ کا اس وجہ سے ہے کیونکہ وہ ہر جنگ میں دشمنوں کے صفوں پر، بے خوف وخطر، حملہ فرماتے رہتے تھے۔اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل دو درج ذیل اشعار ہیں:

بڑھ کر خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

(بال جبریل، غزل ۴۳)

ہے فکر مجھے مصرعہ ثانی کی زیادہ　　اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن　　یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

(ضربِ کلیم، آزادی شمشیر کے اعلان پر)

پہلے شعر میں ''حیدر کرّار'' سے مراد معرکۂ دین ووطن میں دشمنانِ دین کے مقابلے کے لئے حضرت علیؓ جیسی ایمانی طاقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی کہ دین ووطن کا معرکہ خیبر کے معرکہ سے زیادہ اہم ہے۔کیونکہ اس پر مسلمانوں کی بقا منحصر ہے۔

دوسرے شعر کا پس منظر یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے پنجاب میں ہر قسم کے ہتھیار رکھنے پر پابندی لگادی تھی۔یہاں تک کہ پنجاب کے عوام مذاقاً کہا کرتے تھے کہ ''کنجی سے بھی ڈرتی ہے سرکار ہماری'' کچھ عرصہ بعد حکومت نے یہ پابندی اُٹھالی۔اسی لئے اقبال نہ یہ نظم لکھی جس نظم کے پہلے دو اشعار ہیں:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلمان کبھی تو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعہ اوّل ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

دوسرے زیر تجزیہ شعر شعر میں اقبال نے فقر کو ''شمشیر جگردار'' سے مماثلت دے کر اسے ''حیدر کرار'' کے مترادف قرار دیا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال نے حضرت خالد بن ولید'' کو حضرت علیؓ کی صف میں لا رہا ہے۔ یہ وہی خالد بن ولیدؓ ہیں جو اہل حق کے خلاف، قبل مشرف بہ اسلام ہونے کے، کئی لڑائی میں عکرمہ کے شانہ بہ شانہ لڑے تھے۔ یہ رشتے میں عکرمہ کے چچا ہوتے تھے۔ عکرمہ کے والد ابوجہل اور خالد بن ولیدؓ چچا زاد بھائی تھے۔ مگر معترف بہ اسلام ہونے کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کے کارنامے تاریخ اسلام میں سنہرے حروف میں لکھنے کے لائق ہیں۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں جب ۸ھ میں انہوں نے موتہ کی جنگ میں رومیوں کو شکست دی تو رسول اللہؐ نے اس کارنامہ کی وجہ کر آپؓ کو ''سیف اللہ'' کا خطاب عطا فرمایا۔ بعد میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اُسی سال عراق کو فتح کیا جو ایران کا صوبہ تھا۔ آپؓ کی وفات ۱۱ھ مطابق ۶۴۲ھ میں ہوئی۔

کرّاری

''کراری'' کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل درج ذیل دو اشعار ہیں:

دلِ بیدار فاروقی، دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

(بال جبریل، غزل ۱۴، دوم)

''کراری'' سے دوسرا شعر ''حیدری'' کی اصطلاح میں ''ضربِ کلیم'' کی نظم ''محراب گل'' افغان کے افکار'' کے دسویں۔۔ کا گزر چکا ہے۔

پہلے شعر میں ''کراری'' کی اصطلاح سے مراد عشقِ رسولؐ میں گریدگی ہے جو صرف دل کی بیداری سے پیدا ہوتی ہے ور جس کی دوسری مثال اس شعر میں حضرت عمر فاروقؓ کی دی گئی ہے جو بعد میں دوسرے خلیفہ ہوئے۔ قبل مشرف بہ اسلام ہونے کے حضرت عمر فاروقؓ رسول اللہؐ کے جانی دشمن تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار وہ گھر سے رسول اللہؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے تو راستہ میں کسی نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو کیونکہ تمہاری بہن اور تمہارے بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لوٹ کر جب گھر پہنچے تو ایسا ہی پایا۔ اور

بہن کو بہت مارا۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہی تھی۔ مجھے سناؤ۔ وہ سورۂ طٰہٰ پڑھ رہی تھیں۔ کلام سن کر آپ اُٹھے اور سیدھے رسول اللہؐ کے یہاں پہنچ کر اسلام قبول کرلیا۔ چونکہ سورۂ طٰہٰ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا باعث بنی اس لئے اقبال نے ''بالِ جبریل'' کی غزل (دوم) کا یہ شعر ہے جس میں ''طاہا'' اسی واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

''کراری'' سے ترتیب دئے گئے دوسرے شعر پر روشنی ''حیدری'' کی اصطلاح میں ڈالی جا چکی ہے۔

اسداللٰہی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں اقبال کے کلام میں حضرت علیؓ کی شان میں اشعار جلد ختم نہیں ہوتے۔ اقبال نے حضرت علیؓ کے لقب ''اسد'' سے ایک اصطلاح ''اسداللٰہی'' بھی وضع کی ہے جس کا ذکر لائے بغیر شاید موضوع تشنہ ہی رہ جائے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

''اسد'' کے معنی شیر کے ہیں اور ''اسداللٰہی'' کے معنی اللہ کے شیر کے ہیں۔ جو حضرت علیؓ کا لقب تھا۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں کل تین درج ذیل اشعار ہیں۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجۂ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

(بانگِ درا، میں اور تو، بعد از نظم، شکسپیئر)

نہ خدا رہا، نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم ہے
نہ رہی کہیں اسداللٰہی، نہ کہیں ابولہبی رہی

(بانگ درا، غزلیات، حصہ سوم، ساتویں غزل)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

(بال جبریل، غزل ۳۴)

پہلے شعر میں ''اسد اللہی'' کی اصطلاح سے حضرت علیؓ کی شانِ فقر کی صورت اور وہ سب کچھ مراد ہے جو اُن کی فضیلت اور صفات سے منسوب ہیں۔ دوسرے شعر میں بھی حضرت علیؓ کی وہی شانِ فقر مراد ہے۔ اور تیسرے شعر میں اس اصطلاح سے اقبال کیا مراد لیتے ہیں اس کی وضاحت اس غزل کے درج ذیل شعر میں نے زیرِ تجزیہ شعر کے بعد ہی کی گئی ہے۔

آئینِ جواں مردی حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

پہلے شعر میں اقبال نے خیبر کے یہودی سردار مرحب سے مرجبی اور اس کے بھائی عنتر سے عنتری کی اصطلاحیں وضع کی ہیں جن دونوں کو خیبر کی جنگ میں حضرت علیؓ نے قتل کیا تھا۔

تیسرے شعر میں ''بوئے اسد اللہی'' رمز ہے اس جذبہ کا جو الوہی صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنے کے لئے دل میں پایا جاتا ہے۔ یہی انسانی سعی کا انتہائے مقصود ہے۔ اس پر تزکیہ نفس سے متعلق تمام اعمال مرتکز ہیں یا ہونے چاہیں۔ انسانی کوششوں کی منزلِ الٰہی یہی ہے کہ وہ صفاتِ ربانی کے آئینہ میں اپنے کو ڈھالے۔ ''بوئے اسد اللہی'' کی اصطلاح میں ایک طرح کی منقلب شبیہ کی طرف اشارہ پوشیدہ ہے۔ انسان کے لئے خدا کا تصور قائم کرنا انسانی تخیلات اور تصورات کے وسیلے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے اس کے لئے ارتقا کے کمال کی منزل یہی ہے کہ وہ خدا کے انسانی تصور کے مطابق اپنی شخصیت کی تکمیل کا راستہ بنائے۔ اس طرح خدا اور انسان کے درمیان ربط و اتصال کا سلسلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ .....☆.....

ڈاکٹر سید عبدالباری
سابق صدر شعبہ اردو، اودھ یونیورسٹی
فیض آباد، یوپی

بیسویں صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اقبال

اُردو شاعری کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے بیسویں صدی میں اقبال جیسا عبقری حاصل ہوا جس نے جانگسل تعقل اور جانگداز فکری ونظریاتی کشمکش کے اس عہد میں نہ صرف اردو شاعری کیلئے ایک حیات بخش اور فکر انگیز فضا میں سانس لینے کے حالات پیدا کئے اور کہنہ از کار رفتہ اور لغو مضامین وموضوعات کے گرد گردش کرنے سے اسے نجات دلائی بلکہ پورے مشرق میں خودی وخود اعتمادی، عزت نفس، جہاں بینی اور جہاں بانی کا ولولہ پیدا کیا۔ اقبال نے مشرق کو نہ صرف اپنا کھویا ہوا وقار اور لٹی ہوئی آبرو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے جھنجھوڑا بلکہ مغرب کے گمراہ کن تعقل اور فتنہ جو تجربہ ومشاہدہ کے سائنٹفک منہاج کو وحی الٰہی اور پیغمبرانہ اسوہ سے مستنیر کر کے انسانیت کیلئے فیض بخش اور حقیقی ارتقاء کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ اقبال نے نہ صرف شاعری کی دنیا میں ایک جدید شعور کا اظہار کیا، ایسا شعور جو مغربی تہذیب اور صنعتی تمدن کی بنیادی خامیوں سے باخبر تھا بلکہ اسے ایک ایسے ادراک سے روشناس کرایا جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں پر محیط تھا۔ اقبال ماضی کی تابناک شعاعوں سے حال کی تاریکیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے طلوع ہونے والے آفتاب کی بشارت دے رہے تھے جو ایک نئے روحانی واخلاقی تبدیلی کا نقطہ آغاز ہوگا۔ اقبال کے سینے میں جو اضطراب جو تپش جو بیقراری اور آرزومندی تھی اس نے نہ صرف ان کو بیسویں صدی کے فکر وتعقل کے آشوب وابتلا سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت عطا کی بلکہ انہوں

نے پوری نسل کو مغرب کی مادی و ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے پر کمر بستہ بنا کر کھڑا کر دیا اور ایک ایسا ولولہ عطا کیا جو برصغیر ہی نہیں ایشیا کے مختلف حصوں میں اسلامی نشاۃ ثانیہ یا نژادِ نو کے ایک تابناک دور کا نقطہ آغاز بنا۔ اقبال کی شخصیت کو فطرت نے اس نشاۃ نو کیلئے اور اس عہد کے سوئے ہوئے انسانوں کو جگانے کیلئے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے مزین کیا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ قدیم و جدید دونوں کا وہ سنگم تھے اور مشرق و مغرب دونوں کے علمی و فکری سرچشموں سے پوری طرح سیراب ہوئے تھے۔ خوش قسمتی سے ابتداء ہی میں انہیں مشرقی علوم اور اخلاقیات کے ماہرین کا قرب حاصل ہوا اور ایک ایسا خانوادہ ملا جس میں روح کو جسم پر اور اخلاق کو مادی اسباب پر فوقیت دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام کے مراحل میں کچھ تو سرسید کی علی گڑھ کے فیض سے، کچھ بعض روشن دماغ و جرأت مند علماء کے طفیل اور کچھ بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والی دور اندیش و روشن دماغ اور عالمگیر شخصیتوں کے اثر سے اقبال کو اپنے ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کرنے اور اپنا فکری نصب العین معین کرنے میں مدد ملی۔ پھر سفر یورپ نے اقبال کو اپنی زندگی کے مشن اور اپنی ترجیحات کے تعین میں بڑی مدد ملی۔ آزاد حکمران، مادی اعتبار سے ترقی یافتہ اور مختلف عقلی و تجربی علوم میں بے شمار نظریات اور فلسفوں کو جنم دینے والا یورپ ان کے سامنے تھا جس کے سامنے غلام مشرق سربسجود تھا۔ مغرب کے فکری و ذہنی دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ مشرق کے اہل علم و اہلِ نظر اس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ خود مسلمان اہل علم کی ایک بڑی تعداد یہ سمجھتی تھی کہ اس صدی میں اسلام کی تعلیمات پر زندگی کے ہر شعبہ میں عمل ناممکن ہے۔ بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مغربی علوم و فنون کا اس قدر رعب تھا کہ عام تصور پایا جاتا تھا کہ خالص اسلام اس زمانہ میں نہیں چل سکتا اور مغربی تہذیب سے مصالحت (Compromise) ضروری ہے اور اس کو اسلامی نظریات میں ڈھالنا چاہیے۔ علامہ اقبال کا اسلامی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں سب سے بڑا عطیہ (Contribution) یہ ہے کہ انہوں نے اس فریب کو توڑا۔ چنانچہ اس صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کیلئے ابھرنے والی ہر

تحریک اور ہر جدوجہد کو اقبال سے سہارا ملا۔ انہوں نے مغرب کے ایک ایک قاہرانہ نظریہ اور جلال فلسفہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور جس طرح کل کے سورج کے طلوع ہونے پر انہیں یقین تھا اسی طرح انہیں یقین تھا کہ مغرب اپنے بچھائے ہوئے دام تزویر میں خود الجھ جائے گا اور جس تمدن کو اس نے ترقی اور روشن خیالی کی علامت بنا کر ساری دنیا پر مسلط کیا ہے وہ فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

پروفیسر محمد اکبر منیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''اسلام کی عظمت کا زمانہ انشاء اللہ قریب آرہا ہے۔'' ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''میرا مذہبی عقیدہ ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا ایک بار پھر جلال اسلامی کا نظارہ کرے گی۔'' اپنی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ میں، ابلیس کی زبان سے ابلیسی نظام کے کارپردازوں کے جذبات کی اس طرح ترجمانی کی ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اسی امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

یورپ سے واپس آنے کے بعد اقبال نے خود اپنے وطن میں انگریز کی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کو بچشمِ خود دیکھا۔ مسجد کانپور اور جلیانوالہ باغ کے واقعات ہوئے۔ پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انہوں نے انگریزوں کی عیارانہ ڈپلومیسی سے ترکوں کا کلاہ لالہ رنگ کو رسوا کرتے ہوئے اور خلافت کا شیرازہ بکھرتے دیکھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگیں پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے مرکز توجہ تھیں اور عالم یہ تھا کہ جب لاہور میں انہوں نے اپنی نظم کے آخری اشعار پیش کئے تو مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

حضور نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

لیکن فضا جتنی اندوہناک اور اضطراب وانتشار جس قدر شدید تھا اسی اعتبار سے شاعرِ مشرق کے دل میں یہ یقین روز بروز پختہ سے پختہ تر ہو رہا تھا کہ اس دنیا کا مستقبل اب اسلام سے وابستہ ہو چکا ہے اور ایک صبح روشن بہت جلد ہونے والی ہے۔ اقبال اس وقت اپنی شاعری کے ذریعہ حالی، شبلی اور اکبر کی طرح اہل مشرق اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کو اور ان کے علماء دانشوروں، نوجوانوں اور محنت کشوں کو پکار رہے تھے کہ وہ ایک عظیم خلاء کو پُر کرنے کیلئے خود کو تیار کریں۔ علامہ سلیمان ندوی کو اسی زمانہ میں تحریر کرتے ہیں۔

> ''دنیا اس وقت ایک عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب وتمدن ابھی حالت نزع میں ہے۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس تشکیل جدید کا کہاں تک مد ہو سکتا ہے؟''

اپنی شاعری اور تحریر وتقریر کے ذریعہ علامہ نے مشرق کی بیداری کے ساتھ ہی ساتھ اسلام کی نژادِ نو کی بھرپور کوشش کی بلکہ بقول جناب نعیم صدیقی یہ ان کی زندگی کا بنیادی مشن بن گیا۔ وہ قوم پرستی، وطن پرستی، نسل پرستی وغیرہ کے فتنوں سے اہلِ ایشیا کو خبردار کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک فی الحقیقت جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ آدمی کا عقیدہ اس کی تہذیب اس کی تاریخی روایات ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ''میری نگاہ میں یہ چیزیں اس

قابل ہیں کہ جن کی خاطر آدمی کا جینا اور مرنا ہو، نہ کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ عارضی طور پر روح انسانی کا رابطہ ہو گیا ہو۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کیلئے وہ شریعت اسلامیہ کے نفاذِ، اسلامی آئین کی تدوین اور فقہ کی تدوین جدید پر بار بار زور دیتے ہیں اور حتی الامکان عملی اقدامات بھی کرتے ہیں۔ مستشرقین کے ان امور کے بارے میں پھیلائے زہر کو ختم کرنے کیلئے وہ تحقیق و تصنیف کے متحدہ منصوبوں کی طرف اپنے زمانہ کے ہونہار اہلِ نظر کو متوجہ کرتے ہیں۔ عمر کے آخری دور میں وہ خود بھی قرآن کے متعلق ایک اہم کتاب لکھنے کے آرزومند تھے مگر صحت اور عمر نے ساتھ نہ دیا۔ علامہ اتحاد پر اگرچہ بہت زور دیتے ہیں کہ اس کا دروازہ کھلنا چاہیے لیکن گمراہ کن تجدد کے خلاف ہے۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تحقیق
مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

بیسویں صدی میں بقول ڈاکٹر رضی الدین ''انسانوں کے انفرادی و اجتماعی پہلوؤں پر اس قدر ہمہ گیر اور وسیع نظر رکھنے والا مشرقی شاعر سعدی اور رومی کے بعد اقبال کے سوا اور کوئی نہیں ہوا۔'' یہ سچ ہے کہ اقبال نہ صرف مشرق و مغرب کے تمام انقلاب آفریں نظریات سے پوری طرح آگاہ تھے بلکہ ان عناصر و احوال سے بھی باخبر تھے جو قوموں اور ملکوں اور نظریات کے عروج و زوال کا سبب بنتے ہیں اور پھر ملت اسلامیہ کے نژادِ نو کیلئے ایک ایسا ولولہ انگیز پیام انہوں نے دیا کہ مشرق کے ذرہ ذرہ میں قوت نمو پیدا ہو گئی اور غلامی کے زنجیروں کو سازِ دلیری سمجھنے والے آزادی و خودداری کے جذبہ سے سرشار ہو کر اٹھے۔

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کی
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال ملت کے استحکام اور اس کے اندر حرارت گداز اور حوصلہ مندی پیدا کرنے کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر فرد ملت خودی، فقر اور عشق کے راز کو سمجھے اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ مشرق کی بے عملی و بے دست و پائی کا سبب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے اندر ذہنی و فکری کجی پیدا ہوگئی ہے اور بے حسی انفعالیت اور جمود کو اس نے اپنے لئے باعث خیر و برکت سمجھ لیا ہے۔

پڑے ہیں صورت نقش قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

اقبال کو حیرت ہے کہ یہ سرد مہری و انفعالیت آخر اس ملت پر کیوں کر طاری ہوگئی جو اسلام جیسے حیات آفریں پیغام پر ایمان لائی ہے جو سرتاسر حرکت و عمل ہے۔ اقبال ان جانگداز حالات سے خود روشناس ہیں جنہوں نے افراد ملت کے حوصلہ نمو کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسرے جنگ عظیم تک دنیا کے چپے چپے پر برطانوی ڈپلومیسی کی وجہ سے زبردست توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا، سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے عرب و عجم میں تفریق پیدا کرنے، قوم پرستی کی شراب سے مخمور بنا کر بھائی کو بھائی سے لڑانے، فلسطینی میں صیہونی ریاست کے قیام کیلئے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا ایک خوفناک سلسلہ جاری

تھا۔ حالات ایسے تھے کہ بڑی سے بڑی اولوالعزم قوم بھی مغرب کے سامنے سرنگوں ہوجاتی۔ ہندوستان میں تو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے فرار اور شکست خوردگی ایک پسندیدہ شئے بن چکی تھی۔ اقبال جب ۱۹۲۱ء میں اپنی تاریخی اہمیت کی حامل نظر خضر راہ لکھ رہے تھے یوں تو یہ سارے احوال ان کے سامنے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مشرق میں جو لوگ ایک حیات آفریں فکر اپنے دامن میں رکھتے ہیں حالات کی ناسازگاری و سنگینی سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ ان کی آواز بیٹھ گئی ہے اور غلامانہ اطوار کو اپنے دین کا جز بنانے پر کمر بستہ ہیں اور مغرب کے در پردہ اشاروں پر کام کر رہے ہیں۔

دین شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفہ روباہی

ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

بدن غلام کا سوز عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات۔ خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے۔

اقبال ایک مردہ و افسردہ قوم کے تن واماندہ میں نئی روح پھونکنے کیلئے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہاں سے انہیں یہ روشنی حاصل ہوتی ہے کہ فرد کی بقاء اور قوموں کی تعمیر و ترقی کیلئے مسلسل جدو جہد معرکہ آرائی اور پیہم محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سعی و عمل اور سخت کوشی کے بغیر کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنی نظم خضر راہ میں وہ حرکت پیہم کی علامت کے طور پر خضر کی بڑی دلآویز تصویر میں پیش کرتے ہیں اور صحرانوردی، صحرائیت اور بدویت کی تلقین کرتے ہیں۔ مغرب کی سرتاپا تصنع ثقافت کے طلسم سے نجات دلانا ان کی زندگی کا

مشن ہے۔ اسلام کی سادہ تعلیمات کی طرف وہ ملت کے نوجوانوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک صحرانشین یا مرد کہستانی کے اندران کے آئیڈیل مردِ مومن کی بہت سی صفات اس کے طرز زندگی اور وظائف حیات کے سبب پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ نشاۃ نو کیلئے وہ خودی، فقر اور عشق پر بار بار زور دیتے ہیں۔ فقر کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان کی حاجات وخواہشات نہایت محدود و مختصر ہوں۔ تکلفات میں پرورش پانے والا انسان جوش و ولولہ سے محروم ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین صحرا کی سعادتوں کا سنگ بنیاد ہے سادگی فقر خود اعتمادی اور ہوا کے رُخ کے خلاف اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی علامت ان کے نزدیک لالہ صحرا ہے جو اقبال کا رفیق و دمساز ہے۔

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی

اقبال نژادِ نو کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں ٹھیٹھ قرآنی تصورات کی طرف امت دوبارہ واپس آئے۔ مغرب کے فلسفوں میں اس کائنات کے وجود کو اتفاقی تسلیم کیا گیا یا پھر اسے مادہ کی کرشمہ کاری قرار دیا گیا۔ ملوکیت سے اشتراکیت تک سب اسی بنیادی فکر کے حامل رہے ہیں۔ دوسری طرف مشرق میں انسان کو بے بس، عاجز و مسکین قرار دیا گیا یا پھر اس کے وجود کو ایک وبال سمجھا گیا۔ ارسطو سے شوپنہار تک زندگی کو بلائے بے درماں اور دنیا کو خراب آباد تصور کیا گیا۔ اسلامی فکر و تہذیب کے عہد زوال میں بھی عجمی تصورات تصوف اور فلسفیانہ مکاتب فکر کی راہ سے اسلامی نظام فکر میں داخل ہو گئے۔ تسخیر کائنات اور اس مادی دنیا ما مثبت انداز سے تصوف غیر مذہبی افعال قرار پائے۔ اقبال نے اسی باطل اور غیر اسلامی طرز فکر کو بدلنے کی کوشش کی اور تسخیر کائنات کو ایک مومن کا حق اور اس کی ذمہ داری قرار دیا۔ اقبال نے کائنات کے ساتھ انسان کے وجود کے بارے میں بھی باطل نظریات کو چیلنج کیا اور انسان کو لاچار و مجبور و بے بس سمجھنے کے بجائے اسے ایک بلند و برتر ہستی اور زمین پر اللہ کا خلیفہ و جانشین قرار دیا۔ کائنات کے نظام

میں انسان کو جو مرکزی مقام حاصل ہے اسے اقبال بار بار ابھارتے ہیں اس کے ساتھ ہی موجودات عالم سے استفادہ کے جو اخلاقی ضوابط قرآن نے عطا کیے ہیں اس کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ انسانی شرف وفضیلت کو میر تقی میر کے بعد اقبال کے علاوہ اردو کے کسی اور شاعر نے اس پر جوش اور والہانہ انداز سے نمایاں نہیں کیا ہے۔

اقبال نے اپنی ممتاز نظموں خضر راہ، ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ وغیرہ میں عصر حاضر کے غالب وکارآفریں سیاسی واجتماعی فلسفوں اور نظاموں کی نظریاتی اساس کو منہدم کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں اسلامی فکر کے احیاء پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ملوکیت وشہنشائیت اقبال کے نزدیک اسلامی تاریخ کا اندوہناک باب ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تعمیری قوت معطل ہوکر رہ گئی۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو پر نئے سال کا پیغام نشر کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا ''جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس مذموم قومیت اور اس قابل نفرت ملوکیت کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ نہیں جاتے اور جب تک لوگ اپنے عمل سے یہ ثابت نہیں کرتے کہ ساری دنیا خدا کا کنبہ ہے جب تک نسل ورنگ اور جغرافیائی قومیتوں کا مکمل خاتمہ نہیں رہ جاتا وہ کبھی پرمسرت اور مطمئن زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں ہوسکیں گے۔''

اقبال کے سامنے جب وہ اسلامی نظام فکر اور طرزِ حکمرانی اور اندازِ تمدن کے احیاء کی بات کررہے تھے سب سے بڑا چیلنج مغرب کے ان نظریات کی طرف سے تھا جو بظاہر بے حد دلکش اور سحر انگیز تھے اور جن کے طلسم میں ایک دنیا اسیر تھی، میری مراد ہے جمہوریت، قوم پرستی، اشتراکیت، نظریہ ارتقا وغیرہ۔ اقبال کی تمام اہم نظموں میں اس چیلنج سے پنجہ آزمائی کی گئی ہے۔ خاص طور پر بے خدا و سیکولر جمہوریت قوم پرستی اور اشتراکیت پر اقبال نے گہری ضرب لگائی ہے۔ جمہوریت کو وہ ایک ناقص طرزِ حکومت تصور کرتے ہیں جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے مگر ان کے خیالات کو تولنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ مغرب کی اسی پُرفریب حکمت عملی کا طلسم توڑتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور مذہب صرف انسان کی پرائیویٹ لائف کا مشغلہ ہے۔ اس کو اجتماعی امور سے کوئی تعلق نہیں۔

دین وسیاست کی تفریق کے ساتھ مغربی تہذیب نے انسان کی مطلق آزادی کا پرفریب تصور پیش کیا اور اخلاقیات کی گرفت سے حیات انسانی کو مکمل چھٹکارا دلانے کی کوشش کی۔ لیکن مغرب کے انسان دوست، لبرل، آزاد اور جمہوری معاشرہ میں بھی انسان انسانوں پر اس طرح ظلم کرتے ہیں جیسے کہ غیر متمدن اور وحشی قبائل کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ اقبال کو اس صورت حال پر بے حد تاسف ہے۔

نظام پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

اقبال کے عہد میں اشتراکیت اسلام کیلئے ایک بڑا چیلنج بن کر سامنے آئی جس نے معاشی مساوات کا بڑا سحر انگیز نعرہ لگایا اور سرمایہ داری کے خلاف محنت کشوں اور مزدوروں کو اٹھ کھڑے ہونے کا پیام دیا۔ اقبال نے اس ملحدانہ مادیت سے ملت اسلامیہ کو خبردار کیا جس کی گرفت میں ایشیا کے بہت سے مسلم ممالک کے عوام آتے جارہے تھے۔ اقبال نے اشتراکیت اور جمہوریت دونوں کو مادیت کی بیٹیاں قرار دیا۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ ملت روسیہ کو قرآن کے اقتصادی خاکہ سے روشناس کراتے ہیں اور تاریخ کی مادی تعمیر کو سراسر غلط

قرار دیتے ہیں۔ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں اقبال رقمطراز ہیں:

''جب تک اقوام عالم کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔۔۔اس بات کے امکانات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ وہ (اسلام) آج بھی ایسی دنیا وجود میں لاسکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی مرتبہ اس کی نسل رنگ یا دولت پر نہیں اس طرز زندگی پر جو وہ بسر کرتا ہے متعین ہوتا ہے۔ جہاں غریب مالداروں سے ٹیکس وصول کرتے ہیں اور جہاں ایک اچھوت تک ایک بادشاہ کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے۔ جہاں شخصی ملکیت ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں سرمایہ کے جمع ہونے اور حقیقی پیدا کرنے والے اور غالب آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔''

مگر اقبال کو اشتراکیت کی آندھی اور طوفان کی طرح مسلم ممالک میں پھیلنے پر سخت تشویس تھی اور اس تشویش کا اظہار انہوں نے ایک خط میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''آج اسلام جس آزمائش سے دوچار ہے اس سے بیشتر ہماری ساری تاریخ میں اس سے بڑی آزمائش سے دوچار نہیں ہوا تھا۔''

اس چیلنج کا سامنا کرنے کیلئے وہ اپنی ملت کو بیدار کرتے ہیں کہ وہ اپنی نوجوان نسل کی تربیت اور صحیح معنوں میں فکری نشوونما پر پوری توجہ دے۔ اقبال خود اشتراکیت کے ناخداؤں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے نظام کیلئے مثبت بنیادیں تلاش کریں۔

اے کہ می خواہی نظام عالمے
جستۂ او را اساسے محکمے

اقبال نے تاریخ کا بھی ایک خالص اسلامی نظریہ مغربی و اشتراکی مورخین کے بالمقابل پیش کیا اور بقول نعیم صدیقی اقبال کی نگاہ میں تاریخ حق و باطل، خیر و شر یا کفر و دیں

نام کی دوقوتوں کی روداد کشمکش ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل

اقبال نے نشاۃ ثانیہ کیلئے اخوت ووحدت پر اپنی شاعری اور اپنے خطبات اور تحریروں میں خاصا زور دیا۔ انہیں ترکوں اور عربوں کی آویزش پر بے حد صدمہ تھا۔ خلافت جس شکل میں ہو بہر حال مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کے انحطاط پر ان کو بڑا قلق تھا۔ یہ دیکھ کر وہ غمگین تھے کہ مسلمان اپنے ہی بھائی کا گلا کاٹنے پر کمر بستہ تھے۔

ہوگیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لہو
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

علامہ کے ربط وضبط ملت بیضا سے متعلق اشعار لوگوں کے زبانوں پر چڑھ گئے اور وہ تخریبی طاقتوں سے آگاہ وہ باخبر ہوئے اور ربط باہم کی بہت سی شکلیں پیدا ہوئیں۔ مختلف اسلامی ملکوں میں اسلامی احیاء اور اتحاد ملی کیلئے متعدد تحریکیں اور تنظمیں وجود میں آئیں۔ آج علامہ کے یہ اشعار ہمارے ملی مزاج کے ترجمان بن گئے ہیں۔

بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اسی نکتے سے اب تک بے خبر

اقبال نے اپنے کلام سے اس قدر اپنی افسردہ ملت کو اچھے دنوں کے بشارتیں دیں اور ایک روشن وتابناک سحر کے جلوے اپنے اشعار میں دکھائے کہ اسلامی نشاۃ ثانیہ خواب سے

حقیقت کی منزل میں آ گئی۔ ہماری نئی نسل ان اشعار کے آغوش میں پلی اور بڑھی ہے اس لئے وہ ایک روشن مستقبل پر زیادہ پختہ یقین رکھتی ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گرانخوابی

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنادیا ہے قمار خانہ

اپنی مشہور نظم ساقی نامہ میں اقبال نے نہایت والہانہ انداز میں اسلامی احیاء کے لئے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم فنی اعتبار سے بھی اقبال کا ایک شاہکار ہے۔ لطف یہ ہے کہ ساقی نامہ جس وقت ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا اس وقت ایران اور ترکی دونوں رضا شاہ پہلوی اور مصطفیٰ کمال کی قیادت میں مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا تھے اور اسلامی روایات کو ایک ایک کر کے مٹا رہے تھے مگر اقبال پر افسردگی و قنوطیت کا کوئی سایہ نہیں۔ وہ بیداری کی اس لہر کا ذکر کرتے ہیں جو ساری دنیا میں آئی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ گرانخواب چینی سنبھل رہے ہیں، برطانوی امپیریلزم لڑکھڑا رہا ہے اور ملوکیت و سرمایہ داری آخری سانسیں لے رہی ہے اور جو قوم جدید دور کے تقاضوں کو محسوس نہ کرے گی تو مٹ جائے گی۔ وہ مسلمانوں کے انحطاط کا دردناک نقشہ کھینچتے ہیں۔ فقہی موشگافیوں اور عجمی اور یونانی روایات کی پیروی پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

لیکن پھر وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے سینے کی گرمی ملت کے جوانوں کے سینوں میں منتقل کر دے۔ اس مرحلہ میں ساقی نامہ کے ہر ہر شعر سے احیائے اسلام کی سچی آرزو منعکس ہوتی ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری

مرے قافلے میں لٹادے اسے
لٹادے ٹھکانے لگادے اسے

اقبال اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔'' ساقی نامہ میں ہمارا مفکر شاعر جس کا سینہ اسلام کی حیات تازہ کیلئے بے قرار ہے اس کائنات کے مختلف مظاہر پر نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر جگہ اس کی حرکت، نمو، تموج اور وفور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ زندگی جہد مسلسل کے بغیر پایہ تکمیل کو

نہیں پہنچ سکتی۔ٹھہراؤ اور جمود اس کے نزدیک فریب نظر ہے۔ گویا وہ تاریخ انسانی کے ان تمام نظریات کو رد کر دیتا ہے جو انسان کو جوہر عمل سے محروم کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے پرورش خودی کی تلقین کرتے ہیں جو انسان کو سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔

اقبال اپنی مشہور نظم ''مسجد قرطبہ'' میں زمانہ کو تخلیقی فعلیت (Creative Activity) قرار دیتے ہیں جس میں نہ ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔ وہ مغرب کے زمانہ کے بارے میں تباہ کن تصورات کے فریب سے ملت کو نکالنا چاہتے ہیں جو ماضی و حال و مستقبل میں وقت کو تقسیم کر کے ماضی کو از کار رفتہ اور پستی کی علامت قرار دیتے ہیں اور ارتقاء کا مفہوم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل سے جسمانی و مادی صلاحیتوں کے اعتبار سے بہتر ہوتی ہے۔ ادھر مشرق میں دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری بڑا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور وقت کو ایک بڑی تخریبی طاقت کہا گیا ہے جو انسان کے سارے کارناموں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اقبال کا تصور زماں بے حد انقلاب آفریں ہے۔ اس میں نہ دن ہے نہ رات نہ ماضی نہ حال۔ یہ ایک مرور خالص ہے جس میں کسی وقت بھی آدمی کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ ایک باشعور انسان زندگی کے ہر لمحہ میں اللہ کی توفیق اور اس کے فضل کا منتظر رہتا ہے کہ کب اسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت کا جمود و سقوط مغرب کے پیدا کردہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ اب اسلامی فکر بوڑھی ہو چکی ہے اور جس طرح مغرب نے عیسائیت کو پوری انسانی زندگی سے بے دخل کر دیا اسی طرح اسلام کو ریٹائر کر دینا چاہیے اور نئے نئے نظریات کا استقبال کرنا چاہیے۔ اقبال کے عہد میں ماضی پرستی اور رجعت پرستی پر لعنت بھیجنا اور مذہب کو اس کی علامت قرار دینا ایک فیشن بن گیا تھا۔ اقبال اس طلسمی غبارہ سے ہوا نکال دیتے ہیں اور وقت کو برا بھلا کہنا درست نہیں قرار دیتے۔ ان کے نزدیک زندگی اور زمانہ لازم و ملزوم ہے اور زندگی کا حسن و جمال وقت کے صحیح استعمال اور اس کے چیلنجوں کو قبول کرنے میں منحصر ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوالدھر فرمان نبی است

اقبال جب مسجد قرطبہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی و جاں بازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی یاد آجاتی ہے۔ اسی عہد کے مردِ مومن کے ایمان و یقین اور جذبہ عشق کی وہ بازیافت چاہتے ہیں۔ عشق ان کے نزدیک علامت ہے۔ تمام دنیوی و دینی سعادتوں کی جو انسان مسلسل عمل مسلسل جدوجہد اور بے کراں اخلاص سے حاصل کرتا ہے۔ اقبال اس مردِ مومن کی ایک ذہنی تصویر جگہ جگہ بناتے ہیں جو مستقبل کی زمان اپنے ہاتھ میں لے گا اور اس عہد کے انحطاط و انتشار کو ختم کرے گا۔ اس مردِ مومن کو وہ فقر اور عشق کے اوصاف سے مزین دیکھنا چاہتے ہیں اور اندلس کے ان عالی حوصلہ اور بہادر مسلمانوں کو یاد کرتے ہیں جنہوں نے تہذیب و تمدن اور حکمرانی و جہانبانی کی اعلیٰ مثال قائم کی تھی۔

آہ و مردانِ حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقین

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

اپنی اس بے مثال نظم میں اقبال عصر رواں میں اسلامی نظام کے قیام کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ امت مسلم ایک انقلاب آفریں امت بن کر سامنے آئے اور اپنے اعمال کا سختی سے خود محاسبہ کرے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اقبال بار بار واضح کرتے ہیں کہ انقلاب اسی صورت میں ممکن ہے جب ملت کے سامنے ایک واضح نصب العین ہو اور اس کے حصول کیلئے اس کے اندر ولولہ وشوق عشق کی حد تک پہنچ جائے۔ مگر اقبال کیلئے یہ خواب نہیں حقیقت ہے کہ بہت جلد یہ انقلاب برپا ہو کر رہے گا۔

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

علامہ اقبال نے تعقل و اجتہاد کے بند دروازوں کو کھولنے اور شخصیت پرستی، اندھی تقلید اور افراد کی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی ضرورت پر بار بار زور دیا جس کے بغیر نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں۔ خاص طور پر گمراہ کن تصوف اور بے لگام تجدد دونوں کو نشاۃ تنقید بنایا۔ اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ملت کا اللہ کی کتاب سے تعلق تقریباً ختم ہو چکا ہے اور خود رسول اکرمؐ کی ذات اقدس اور آپ کی سنت اور شریعت کو غلط کار صوفیوں اور درویشوں کی وجہ سے ثانوی حیثیت حاصل ہوگئی۔ علامہ نے ختم رسالت کے فلسفہ پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید کیلئے یہ ناگزیر قرار دیا ہے کہ تنقید و تحقیق اور اجتہاد وتدبر کی کشتی نازک کو آزادی کے ساتھ رواں ہونے کا موقع دیا جائے۔ مزید برآں وہ ملت

کے اصحاب نظر کے اندر پائی جانے والی بے ربطی افکار سے بھی نالاں تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر قوت عمل ختم ہوگئی۔

عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

مغرب نے انسانوں کی فکر کو جس طرح انتشار کا شکار بنایا ہے اس کے سبب وہ زندگی میں کسی واضح نصب العین سے محروم ہیں۔ بس لے دے کے مادی خوش حالی و فراوانی کا ایک مقصد سامنے رہ گیا۔ مزید آزادی افکار کی خود فریبی بھی انہیں طرح طرح کی وادیوں میں بھٹکنے پر مجبور کر رہی ہے۔

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اقبال ملت کو نشاۃ نو کیلئے پیغام دیتے ہیں

اے ز راہ زندگی بیگانہ خیز
از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسمان بالا ترے
دل ربائے دل ستانے دلبرے
مدعا گردد اگر مہمیز ما
ہمچو صرصر می رود شبدیز ما
گردش خونے کہ در رگ ہائے ما
تیز از سعی حصول مدعا

تشکیل جدید الٰہیات میں رقمطراز ہیں:

''مقصد و غایت کا عنصر ہماری دنیائے شعور کی فردا بینی کی صلاحیت دیتا ہے''۔

اقبال کے نزدیک ایک مردِ مومن کا مقصد اولی اعلائے کلمتہ اللہ ہے۔ اپنے مکتوب میں اقبال رقمطراز ہیں:

''کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہیے جس کا مقصد کلمتہ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔''

لیکن اقبال جدید علوم وفنون یا سائنسی طرز فکر کے بارے میں کس طرح کے تعصب کا رویہ اختیار کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ یورپ میں جذبہ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پسندی کہا جاسکتا ہے۔ ایک اور مقام پر وہ اظہار تاسف کرتے ہیں:

''آج مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔''

عصر نو از جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخواستہ
حلقہ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہا
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق
ہوا ہے بندہ مومن فسونی افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک

مگر اقبال کی خوبی یہ ہے کہ صورت حال خواہ کتنی حوصلہ شکن ہو اور حالات خواہ کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہو ان کے ایک روشن مستقبل پر یقین کامل میں کوئی کمی نہیں آتی اور وہ امید و ولولہ کا چراغ برابر جلاتے رہتے ہیں۔

دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہان پیر کی موت

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں
دانہ آں صحرا نشینیاں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند
حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست

علامہ اقبال ملت اسلامیہ کے اندر افتراق وانتشار کو ختم کرنے کیلئے صحیح بنیادوں پر اپنی اجتماعیت کی تعمیر کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں اپنے مشہور خطبہ میں آپ نے فرمایا۔

''اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات وعواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے منتشر ومتفرق افراد بتدریج متحد ہوکر ایک متمیز ومعین قوم کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور انکے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہوتا ہے۔''

اقبال بار بار اس نکتہ پر زور دے رہے تھے جبکہ قوم پرستی کا بھوت بڑے بڑے علماء وشیوخ کے سروں پر سوار تھا۔

''ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان نہ اشتراک وطن نہ اشتراک اغراض اقتصادی ہے بلکہ ہم اس برادری میں جسے جناب رسالتمآبؐ نے قائم فرمایا تھا، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے بارے میں ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ ہم سب کیلئے یکساں ہیں۔''

اقبال لفظ رواداری اور انسان دوستی کے طلسم کو بھی توڑتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''حقیقی رواداری عقلی وروحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ ایسے

شخص کی ہوتی ہے جو روحانی اعتبار سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب
کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے کے مذہب کو روا رکھتا
ہے اور ان کی قدر کرتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری
کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

انسان دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میری نظر میں عملی نقطہ خیال سے اسلام میں تصوراتی مسلک انسان
نوازی (Ideal Humanitarianism) کو حاصل کرنے کے ذرائع
موجود ہیں۔"

اقبال پر جب یہ اعتراضات کئے گئے کہ انہوں نے اپنے پیغام کو عالمگیر بنانے کے بجائے اسلام اور مسلمانوں تک محدود کرلیا ہے تو موصوف نے وضاحت فرمائی کہ یہ خیال غلط ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ موصوف کے الفاظ میں اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کرلیتا ہے۔ مسٹر نکلسن جنہوں نے علامہ کی اسرار خودی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرلیا تھا، کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ
ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دوں اس لئے
کہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کیلئے موزوں واقع ہوئی ہے"۔

مسٹر نکلسن کے اسی خیال کا علامہ حوالہ دیتے ہیں کہ کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔

الغرض پروفیسر عبدالمغنی کے الفاظ میں اقبال نے عالم انسانیت کی تشکیل جدید کا ایک نہایت وسیع اور وزنی نصب العین اختیار کیا اور اپنی شاعری کو اس کی تکمیل کا وسیلہ قرار دیا۔

(صفحہ ۱۰، تشکیل جدید) اور یہ کہ ''اقبال کا نغمہ انسانی روح کے اندر وہ عرفان وانبساط پیدا کرتا ہے جس سے حیات کی تزئین و تنظیم کے ساتھ ساتھ کائنات کی تسخیر و تشکیل کا حوصلہ و شعور بیدار ہوتا ہے۔'' یہ نغمہ ٹیگور کے نغموں کی طرح تھکے ہوئے ذہن کیلئے وقتی فرحت وانبساط کا سامان مہیا نہیں کرتا اور نہ افراد و اقوام کو سلاتا ہے بلکہ یہ نغمہ بیداری ہے۔ شاید یہی اقبال کے اس صدی کا نہیں بلکہ پوری دنیائے شاعری کا عظیم ترین شاعر ہونے کی پہچان ہے کہ ان کی شخصیت میں بھی لشادگی ہے اور ان کے کلام میں بھی ہمہ گیری ہے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی ''اقبال کی شخصیت میں کشادگی اور عظمت کے جو آثار دکھائی دیتے ہیں ان کا سراغ بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا اور وہ پہلے شخص ہیں جن کے کلام میں ایک نئی داخلی تبدیلی احساس و ادراک کے ایک نئے نظام اور ایک نئی تخلیقی سرشت کے نشانات نظر آتے ہیں۔'' اقبال کے مفکرانہ انداز نظر اور ان کے جذبے کی شدت دونوں کو ایک سرچشمہ پر لاکر کھڑا کر دیا اور وہ سرچشمہ تھا قرآن حکیم۔ بقول ڈاکٹر مسعود حسین انہوں نے صرف ادب نہیں مشرق کو فکری بالیدگی عطا کی اور اس فکری بالیدگی کا سرچشمہ ان کے نزدیک قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ عطا کیا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور اعتقاد دوش بدوش نظر آتے ہیں۔''

اقبال وہ خوش نصیب شاعر ہے کہ اس کا کلام بے شمار دلوں کی تھرتھراہٹ اور بے شمار سینوں کے اندر سوز و گداز بن کر زندہ ہے۔ اس پر صرف دانش گاہوں اور مراکز علم و ادب میں تحقیق و تجزیہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ ملتوں، جماعتوں اور گروہوں کے مقدرات سنور رہے ہیں اور ماحول کی ظلمتوں سے ٹکرانے والے روشنی و تابندگی کے علمبردار قافلوں کیلئے اقبال کا کلام رجز بن گیا ہے جس سے رگوں میں لہو کی رفتار تیز ہوتی ہے اور شریانوں میں جوش و ولولہ کا طوفان موجیں مارتا ہے۔ کس شاعر کو اس قدر محبت و احترام کا خراج ملا ہوگا اور کس مفکر کی اس قدر پذیرائی ہوئی ہوگی کہ پون صدی گزرنے کے بعد بھی اس کے نغموں کی

معنویت اور سوز و گداز میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہ والہانہ محبت و احترام کے جذبات شاید اقبال کیلئے اس لئے ہیں کہ اس نے ایک تاریخ ساز فکر کو پھر تازہ کر دیا اور ایک انقلاب آفریں امت کے دلوں میں ایمان و یقین کی چنگاریاں پھر پیدا کر دیں۔ آخر میں اقبال ہی کے چند اشعار میں ان معروضات کو ختم کرتا ہوں۔ ؎

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

پروفیسر بشیر احمد نحوی

شورش کاشمیری کی شاعری پر فکر اقبال کے اثرات

ہندو پاک کے جن مایہ ناز انقلابی رہنماؤں نے راقم کو عنفوانِ شباب سے ہی مسرور و متاثر کیا ہے ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبیداللہ سندھی اور آغا شورش کاشمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ انقلابی اور فولادی عزم کے سیاسی، ادبی اور دینی قائد ہیں جن کی ذہانت و ذکاوت، شرافت ونجابت اور خطابت وصحافت کی بوقلمونیوں سے میرا ذہن، میری زبان اور میرا حافظہ مانوس رہا ہے۔ میرے والد جناب خواجہ غلام حسن نحوی ابوالکلام کے ''الہلال''، ظفر علی خان کے ''زمیندار'' اور شورش کی ادارت میں چھپنے والے ''چٹان'' کے مستقل قاری تھے اور والد صاحب بخاری، ظفر علی اور شورش کی تحریکِ ختم نبوتؐ کے سلسلے میں تقاریر و تحاریر کا بکثرت ذکر کیا کرتے تھے۔ کالج کے ایام میں شورش کی ایک کتاب ''گفتنی و ناگفتنی'' دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کتاب کے انقلابی آہنگ سے میں اس قدر متاثر ہوگیا کہ کتاب کا تقریبا نوے فیصد حصہ میرے حافظے میں محفوظ ہوگیا جو خدا کے فضل سے آج تک برابر محفوظ ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ شورش کے افکار اور بالخصوص سرورِ کونینؐ کے ساتھ ان کے عاشقانہ اور محبانہ جذبے نے مجھے ان کا شیدائی بنادیا اور میں بار بار ان کے اشعار کے زیر و بم سے محظوظ ہوتا رہا۔

غریبِ شہر ہوں لیکن بلند بام ہوں میں
حضورِ سرورِ کونینؐ کا غلام ہوں میں

کسی حریف سے دبنا میرا شعار نہیں
بپاسِ جادہ و منزل خجستہ گام ہوں میں
مرا سلام نئی پود کے جوانوں کو
حکیم شرق کا ان کے لئے پیام ہوں میں
دل و دماغ کو بطحا نے کردیا مضبوط
محاذِ جنگ پہ شمشیر بے نیام ہوں میں
میں ایک روز مدینے ضرور جاؤں گا
بہ فیض سیدِ کونینؐ خوش مقام ہوں میں
شہنشہوں سے تعلق نہیں مجھے شورشؔ
خدا کا لطف و کرم ہے کہ نیک نام ہوں میں

شورش کاشمیری کے شعری مجموعے گزشتہ پچاس برسوں میں مختلف ناموں کے تحت منظرعام پر آچکے ہیں۔ سال ۱۹۹۶ء میں ان کا پورا کلام ''کلیات شورش کاشمیری'' کے نام سے الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور کے اہتمام سے چھپ کر آ گیا ہے۔ یہ کلیات اٹھارہ سو انیس صفحات پر مشتمل بسیار نویسی کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ ختمِ نبوت، سماجی و سیاسی حالات و واقعات، شخصیات، ذاتی و ارادت، تعلقات، فکاہات، طنزیات، شعریات اور اسلامیات سے متعلق ہزاروں عنوانات کے تحت شورش نے اپنی جولانیٔ طبع، ندرت بیان، قدرتِ کلام اور توانا ادراک و احساس اور تفکر و وجدان کا غیر فانی مظاہرہ کیا ہے۔

سربکف ہوکر نکل آیا ہوں میں
میں کسی غدار سے ڈرتا نہیں
ہیچ ہیں میرے لئے دار و رسن
تیغ کی جھنکار سے ڈرتا نہیں

کانپ اٹھتا ہوں خدا کے خوف سے
چرخِ کم رفتار سے ڈرتا نہیں
منبر و محراب سے آگاہ ہوں
جبہ و دستار سے ڈرتا نہیں
موت کیا ہے؟ مردِ مومن کی اُمنگ
وہ کسی خوں خوار سے ڈرتا نہیں
سورۂ والعصر کا نکتہ شناس
قوتِ اغیار سے ڈرتا نہیں
شاعرِ مشرق کا پیروکار ہوں
یورپی افکار سے ڈرتا نہیں

شورش کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی اس بات کا بھرپور احساس ہوتا ہے کہ وہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے زبردست مداح، خوشہ چین اور ان کے عظیم افکار سے بہت ہی قریب ہیں۔ اقبال کا نام جا بجا ملتا ہے، کہیں اقبال کو جلالِ مشرق، حکیم مشرق، شاعرِ اسلام، عاشقِ رسولؐ، دیوانۂ حجاز، درویشِ بے گلیم، قلندرِ عصر، داعیٔ خودی، نکتہ شناس اور محرم اسرارِ ایمانی کے الفاظ و القاب سے پکارتا ہے۔ شورش کے جذبات کی پشت پر اقبال کے ملّی تصورات کارفرما ہیں۔ وہ کثرت کے ساتھ مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ حکیم احمد شجاع شورش کے بارے میں ان حقائق کو بڑی دیانت داری کے ساتھ ایک مضمون میں یوں قلمبند کر چکے ہیں۔

''میں نے پچھلے ساٹھ ستر برسوں میں بڑے بڑے نامور خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں۔ بڑے بڑے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ فکر کو پڑھا ہے، اور ان کی زبان سے بھی سنا ہے اور بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ شورش کی خطابت میں ابوالکلام کی خطابت کا رنگ منعکس پایا۔ ان کے الفاظ میں ظفر علی خان کی طنز کو جھلکتے دیکھا اور ان کے

جذبات میں اقبال کے اسلامی تصورات کا پرتو پوری آب وتاب سے چمکتے پایا۔''

شورش ''درویش بے گلیم'' کی اصطلاح کو عنوان بنا کر اقبال کے افکار ونظریات اور اثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اک ابر نو بہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبال اس چمن کی رگوں میں سما گیا
دل کا خروش، عشق کا شعلہ نظر کی آگ
اپنے قلم کی گرم نوا سے بڑھا گیا
اس کی صدا تھی صورِ اسرافیل کا جواب
اس کا خروش ہر کہہ و مہہ کو جگا گیا
دہ چند ہیں ادب کی نواہائے تابدار
شعر و سخن کے نام سے موتی لٹا گیا
ضربِ کلیم اس کی نواؤں کا ماحصل
وہ یوں اٹھا کہ مشرق و مغرب پہ چھا گیا
شورش مرے قلم کو دیا اذنِ انقلاب
اور خواجگانِ دہر سے لڑنا سکھا دیا

کلیات شورش کی کسی بھی نظم کے سیاق وسباق کو جب ہم دیکھتے ہیں وہاں اقبال کی فکر کے پرتو، ان کے احساس کی تابنا کی یا اقبال کے کسی شعر کو ہی بنیاد بنا کر ایک نئی دنیا کی معرفت ہمیں نصیب ہو جاتی ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہی ''حکیم مشرق'' رکھا ہے۔ زمانے کے جور و ستم، رنج والم، یارانِ سخن کی پریشاں حالی کے فوراً بعد مزارِ اقبال پر اپنی حاضری اور ان کے مزار کو انقلابِ نو کا مرجع قرار دیکر شورش یوں رقمطراز ہیں:

ابھی تو ہے بجلیوں کی زد میں ہر ایک طائر کا آشیانہ
ابھی تو ہے چہرۂ چمن پر خشونتِ گردشِ زمانہ

ابھی تو دار و رسن پہ رہ رہ کے خونِ ناحق جھلک رہا ہے
ابھی تو یارانِ ہم سخن کے لئے مقدر میں ہے قید خانہ
ابھی تو حوّا کی بیٹیوں کا شباب بکتا ہے راستوں پر
ابھی تو زہر وشوں کی دوشیزگی ہے زیبِ شراب خانہ
عقیدتِ دل کے پھول لیکر چلا ہوں اقبال کی لحد پر
کہ مرجعِ انقلاب نو ہے حکیم مشرق کا آستانہ
''مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیّاد کو رلایا
کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ''

عقیدت اقبال میں شورش بسا اوقات اس قدر گم نظر آتے ہیں کہ وہ تاریخ کی شخصیات کی فہرست میں اقبال کو سرِ فہرست پا کر ان کے کلام کو جبریل امین کے پر کی جنبش و حرکت قرار دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کو غلامِ اقبال کہہ کر ان دونوں بڑے شاعروں پر اقبال کی برتری قائم کرتے ہیں۔

سرِ فہرست ہے تاریخ میں نام اقبال
بالِ جبریل کی جنبش ہے کلامِ اقبال
دین و اخلاق کے بازار کی رونق اس سے
دعوتِ خواجۂ گہیاںؐ ہے پیامِ اقبال
رومی و شبلی و عطار و جنید و حافظ
ان اکابر کے سفینوں میں ہے نامِ اقبال
ایشیا پھر کبھی تقدیر کا شاکی نہ رہے
گر یہاں قائم و دائم ہو نظامِ اقبال
جن کے افکار کی پرواز ہے لادینی تک
پھانس لیتا ہے انہیں دانۂ دامِ اقبال

جوشؔ کیا چیز ہے؟ اور فیضؔ کی حیثیت کیا؟
شورشؔ اس دور میں دونوں ہیں غلامِ اقبال

پاکستان میں احرار کے زیرِ قیادت ختم نبوت کی تحریک زور وشور کے ساتھ چلی اور اس میں بڑے بڑے اکابرین بھی شامل تھے۔ صحافتی، ادبی اور شعری میدان میں مولانا ظفر علی خان اور آغا شورش کاشمیری اس تحریک کے علمبرداروں میں سے تھے۔ احمدی تحریک کے بارے میں اولاً اقبال نرم گوشہ رکھتے تھے اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ایک مبلغ اور ایک مصلح کی حیثیت سے بڑی عزت کرتے تھے۔ بعد میں جب قادیانیت کا اصل رنگ روپ ہندی مسلمانوں کے سامنے ظاہر ہوا تو اقبال نے انگریزی اور اردو میں کئی بیانات شائع کئے، جن میں مسلمانوں کو اس استعماری تحریک کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کیا۔ شورش کاشمیری نے اپنے کلام میں قادیانی مسئلہ کے تمام خدوخال کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے اور جہاں جہاں وہ احمدیت سے وابستہ افراد پر تنقید کے تیر تکے چلاتا ہے تو فوراً اقبال کے جذبۂ وحدت ملّی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے۔ اپنی ایک خوبصورت نظم بعنوان ''اقبال'' میں یوں گویا ہے۔

توحید و رسالت کا علمدار تھا اقبال
قرآن کی دعوت کا نگہدار تھا اقبال
کلکتہ و لاہور سے طہران و نجف تک
آزادیٔ کامل کا خریدار تھا اقبال
وابستۂ انگریز تھے پنجاب کے ٹوڈی
سرکار کی اولاد سے بیزار تھا اقبال
وہ مرشد دوراں تھا بہرحال بہرکیف
جاروب کشِ احمدؐ مختار تھا اقبال

ایک دوسری نظم میں شدت جذبات اور بے محابا انداز تخاطب میں قادیانیت کی تردید

اور اقبال کے فیضانِ اثر کا ذکر کرتے ہیں۔

قادیانی کیا ہیں؟ اسرائیل کے لختِ جگر
ان کے بل ہم نے نکالے اور نہتا کردیا
اس وطن میں دین کے باغی ٹھہر سکتے نہیں
ہم نے اس مقصد کو ہر مقصد پہ اولیٰ کردیا
خواجۂ کونینؐ کی غیرت کا پرچم گاڑ کر
دیدہ و دل کو نثار راہِ بطحا کردیا
صحبتِ اقبال کے فیضان نے شورش مجھے
شہریار یثرب و بطحا کا شیدا کردیا

شورش کا اندازِ تحریر روایتی شعراً کے اسلوبِ تحریر سے بالکل علیحدہ ایک منفرد شان کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں لالہ وگل سنبل ویاسمن اور شبنم وصبا کی تراکیب کے ساتھ ساتھ ربیعہ جیسی خیالی محبوبہ کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا ہے، لیکن عورت، جنس، محبوب، معشوق اور فراق گورکھپوری کی امرد پرستی اور حسنِ نسوانی سے ''ہڈیوں کے پگھلنے'' کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ظلم، سامراج، استبدادی قوتوں اور ملت مسلمہ کے دشمنوں سے بغاوت کا اعلان ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شورش کاشمیری کی پوری شاعری رجزیہ یا رجز نامہ ہے۔ ظہیر کاشمیری ان کی نظموں پر اظہار رائے کرتے ہوئے بڑی پختہ بات کہہ چکے ہیں۔

''شورش کی نظموں کا فنی اور فکری تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر قسم کے اسالیبِ سخن پر عبور حاصل ہے اور وہ اپنے سیاسی تجزیات مختلف قسم کی ادبی ہیئتوں سے آراستہ کرچکے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جن میں باندازِ غنا حرب وضرب کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں۔

زبانِ ذوالفقار میں ڈھلی ہوئی ہے شاعری
غزل کی آب و تاب میں نوائے کارزار ہے"

شورش ایک مدت تک غیر ملکی استبداد کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں اور انہوں نے کئی بار تبریز و منصور کی روایتیں تازہ کی ہیں۔ اس لئے اپنی متعدد نظموں میں انہوں نے جنگی محاذوں کے کینوس سے نکل کر حالیہ جنگ کے بین الاقوامی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی ہے"۔

نظموں کے عنوانات اور ان کے مضامین فکرِ اقبال کی رنگارنگی سے معمور ہیں۔ وہ کہیں براہِ راست اقبال کے کسی خیال کو بنیاد بنا کر نظم ' رباعی یا قطعہ تحریر کرتے ہیں یا اقبال کی ہی زمین پر ایک دلنشین شعری فضا کو جنم دیتے ہیں۔

ماضی مرحوم کے آثار کو آواز دو
دوستو! تاریخ کی رفتار کو آواز دو
مسلکِ اسلاف کی پرچم کشائی حبذا
جرأتِ قربانی و ایثار کو آواز دو
شاعرِ مشرق کلیمِ ایشیا
بالِ جبرائیل کے افکار کو آواز دو

جوش ملیح آبادی کے بہت بڑے نظم گو شاعر اور الفاظ کے جادوگر ہونے میں دو رائیں نہیں لیکن اپنی عظیم نظم نگاری اور بسیار نویسی کے باوجود وہ ہر صاحب اقتدار کا کاسہ لیس رہا اور اپنی آزادروی کو جدیدیت اور ادبی ارتقاء کا نام دیتا رہا۔ شورش نے جہاں جہاں ان کا ذکر کیا ہے، وہاں جوش کی جاہ پرستی، اور زر پرستی نمایاں ہوجاتی ہے۔ شورش اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ان کے مشن کو اعانت اور قوت عطا کرنے میں مسلک اثنا عشریہ اور آلِ بوترابؓ کا بڑا حصہ ہے لیکن جوش مداح اہل بیت تو ہے مگر شورش کی نگاہِ حق پرست میں وہ یزید کے دربار کا شاعر اور شاعرِ مشرق کے حسادوں سے باضابطہ ملا ہوا ہے۔ ایک نظم "جوش ملیح

آبادی کو خوش آمدید کی ایک مجلس میں دیکھ کر'' کے عنوان سے جوش کا مرقع یوں پیش کیا ہے۔

جوش جام و شراب کا شاعر
جوش حسن و شباب کا شاعر
جوش برق ہوس کا کڑکا ہے
جوش اسی برس کا لڑکا ہے
جوش کو اس چمن سے نسبت کیا
اسوۂ پنجتنؑ سے نسبت کیا
بادۂ زر نگار کا ساتھی
ہر نئے اقتدار کا ساتھی
ہر حکومت کی نوکری کی ہے
عمر بھر اس نے چاکری کی ہے
بارگاہِ یزید کا شاعر
منفعت کے رموز کا شاعر
کیسۂ زر جہاں تہاں ہوگا
جوشؔ کو ڈھونڈیئے وہاں ہوگا
آخری عمر میں زوال اس کا
وائے افسوس ارتحال اس کا

جدید شعری منظر نامے میں روایت اور جدت کا سنگم تلاش کر لینا تنقید کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ لیکن کسی کو یہ سنگم دیکھنا ہی ہے۔ مترنم بحروں اور مشکل زمینوں میں احساسات کو چھو لینے والے اشعار شورش کی کلیات میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ جذبہ کی تیز آنچ کو شورش حد سے تجاوز کرنے سے بھی روکتا ہے۔ اس کے کلام میں پاسبان عقل دل کو تنہا چھوڑتا بھی ہے تو بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتا۔ خیالات کی پاکیزگی، فکر کی شائستگی، جذبے کی لطافت

اس کے اشعار کی غذا ہیں۔ الفاظ کی خوش انتخابی اور ترتیب وتہذیب نے کلام میں چستی اور روانی کے ساتھ موسیقیت پیدا کردی ہے۔ تجربات ومشاہدات کی وسعت، نگہہ کی بلندی، فکر کی گہرائی، فن کی تازہ کاری، احقاق حق اور ابطال باطل کی گھن گرج اس کے اشعار کی دلنوازی میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہے۔

کیا ہیں سحر و شام، میں اس فکر میں گم ہوں
اے وقت مجھے تھام، میں اس فکر میں گم ہوں
ہر آن غریبوں پہ حوادث کی ہے یلغار
ہر سمت ہے کہرام، میں اسی فکر میں گم ہوں
انسان کا بادۂ گلگوں ہے تو کیوں ہے
اے گردش ایام، میں اس فکر میں گم ہوں
محصور ہے نافہم مغنّی کی نوا میں
اقبال کا پیغام میں اس فکر میں گم ہوں

☆

سید رسول پونپر

حیات: دستور العمل اور علامہ اقبالؒ

وسیع کائنات در کائنات میں پھیلی حیرت زا اور ہوشربا زندگی ایک منضبط دستور العمل ''مسلسل حرکت'' کے تحت کام کرتی ہے۔ جہاں ایک ایک ذرّہ طلسماتی اعتدال وتوازن پر کاربند ہے۔ یہ سارا نظام عالم درحقیقت ہمارے اپنے وجود سمیت اتنا خودکار وخودآئینہ حیرت ہے کہ عرش وفرش، انس وملک، بحر وبر اور شجر وحجر تسبیح کناں کائنات کی بارگاہِ وحدت میں سجدہ ریز ہوکر سعادت ابدی حاصل کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں تاکہ حمد وثناء کی لا انتہا برکات سے سرفراز ہوا جاسکے۔

" الحمد الله رب العٰلمين۔ الرّحمٰن الرحيم۔ مالك يومِ الدّين۔ اياك نعبُدُ و اياك نستعين۔ اهدناالصّراط المستقيم۔ صراط الذين انعمت عليهم۔غير المغضوب عليهم و لاالضالين۔آمين

اسی لئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دربارِ الٰہی کی چوکھٹ پر ایک ہی سجدے سے تجھے، غیر اللہ کے آگے ہزاروں سجدوں سے نجات ملتی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی ایک سجدہ بنی آدمؑ اور پھر بندۂ مومن کے لئے فضل خداوندی کے بے پایاں کائنات میں داخل ہونے کے دروازے کھولتا ہے۔ پہلے وہ اُسے ''فرشتوں سے یوں رخصت کراتا ہے۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

پھر وہ، اُسے روحِ ارضی سے نہایت ہی بلیغ، انداز میں استقبال کراتے ہوئے خود آگہی، خود شناسی اور عظمتِ آدم اور مقامِ آدمیت سے روشناس کراتا ہے۔ اور رب کائنات سے تخلیق آدم کی غرض و غایت بیان کرتا ہے۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم ورجا دیکھ
ہیں تیرے تصوف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آنکھوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے کے شرر سے
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر سے
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ
نالندہ تیرے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

میلادِ آدم میں اُسے خودگر، خودشکن اور خودنگر کہہ کر جہانِ مجبور میں تہلکہ مچادیا اور حسن و عشق کو لرزہ براندازم کردیا ؎

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد
حسن لرزیدہ کہ صاحبِ نظرے پیدا شد
فطرت آشفتہ کہ از خاک جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

کائنات کے ذرّے ذرّے میں خودگری، خودشکنی اور خودنگری جاری و ساری ہے۔ تعمیر و تخریب اور تخریب و تعمیر کے لامتناہی سلسلے ہی سے حیات جاوداں ایک مسلسل عمل کی صورت میں موجزن ہے۔ رونق حیات اور بقائے حیات کے بنیادی عنصر، یعنی ''حرکت'' یا ''عمل'' کا جزو لاینفک کسب معاش بھی ہے، جسے زندگی کا داخلی توازن قائم و دائم ہے کیونکہ زندہ رہنے کے لئے غذا بھی چاہیے تاکہ تلاش و جستجو کا فطری عمل بھی جاری رہے اور انسان نہ

صرف مادی یا جسمانی طور زندہ رہے بلکہ اس کی روحانی زندگی کا مسرت آگین ابدی سامان بھی ہوتا رہے۔اس کے لئے حسن وتدبیر بھی چاہیے، ذوقِ عمل بھی چاہیے اور استقامت بھی جس کے لئے نہ صرف فطرت کا اشارہ سمجھنا کافی بلکہ شرق وغرب سے اعتدال وآہنگ بھی لازمی ہے کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رنگ یا اس کی کوئی بھی حرکت بے معنی یا بے مدعا نہیں

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو یا بادِ سحر کیا

خدا تمہیں کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است
دمادم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگرامروز تو تصویر دوش است
بخاک تو شرارِ زندگی نیست

اسی بناء پر زندگی ایک جہد مسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ ابتلائے مسلسل بھی ہے۔اس لئے ارشادِ ربانی ہے کہ ''ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے[1]۔اور کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا۔لقد خلقنا الانسان فی کبد۔ ایحسب ان لن

ا۔ سورۃ البلد (۹۰)

یقدر علیہ احد۔ بڑی مشقت، انسان کی گتھی میں پڑی ہو، تو مسلسل عمل سے مغز کی کوئی گنجائش نہیں جس میں اتفاقات و حادثات، مسرت و انبساط اور رنج و غم کی لاتعداد کیفیات اُس سے ثابت قدمی کا مطالبہ بھی کرتی ہیں یہ ثابت کرتے ہوئے کہ ہر امر پر اس کا بس نہیں چلنے والا، اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ بے بس و لاچار ہے۔ تلاش و جستجو اس کا مقصدِ حیات ہے۔ اسے اخروی زندگی کیلئے دنیوی زندگی کو تج نہیں دینا ہے۔ کیونکہ سورۃ الجمعۃ میں ارشاد ہوتا ہے۔ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشرو ا فی الارض وابتغو من فضل اللہ و زکروو اللہ کثیرا، لعلکم تفلحون۔ پھر جب نماز پوری ہو چکے تو تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔

اور پھر جب یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں (اصطلاحِ قرآنی) میں اچھے برے کام کرنے کا جابجا ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''کسب'' کے معنی عربی میں ٹھیک وہی ہیں جو اُردو میں کمائی کے ہیں یعنی ایسا کام جس کے نتیجہ سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو۔ اگرچہ فائدے کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لئے جزا اور سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے۔ جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ پیش آئے گا۔ اگر کسی انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کر لی ہے تو اس کے لئے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کر کے برائی کمائی ہے تو اس کے لئے برائی ہے۔ کل امرئ بما کسب رھین۔ ہر انسان اُس نتیجہ کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے۔

سورۃ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ بتا دیا:

لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (۲:۲۸۶)۔ ہر انسان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی۔ جو کچھ اُسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے اور جس کے لئے اُس سے جوابدہ ہونا ہے۔ وہ بھی اس کی کمائی ہے۔

اس طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتا دیا۔ تلک امۃ قد خلت۔ لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ ولا تسئلون عما کانوا

یعملون۔(۲:۱۳۴)

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی اس کے لئے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔ تم سے اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان لوگوں کے اعمال کیسے تھے[1]

اس لئے معلم اخلاق حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

گندم از گندم بروید جَو ز جَو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اور مکافات عمل مضمون کو علامہ اقبالؒ نے یوں باندھا ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
یقین محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہے یہ مردوں کی شمشیریں

بانگِ درا کی ''سیر فلک'' میں نامہ اعمال کا نقشۂ پرواز تخیل سے ایسے اور اتنے دلنشین انداز میں کھینچتے ہیں۔ کہ لابدی روز حشر کا منظر جنت و جہنم (جزا و سزا) کی تمثیل ہمارے قلب و نظر کو چھو لیتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے آفاقی تخیل کے الوہی بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر موتی چننے کو جی چاہتا ہے۔

ایسے کہ ہمیں اپنے بود و عدم کا احساس ہی نہ ہو اور صرف حیرت در حیرت ایزدی حلقۂ نیک عمل کا گلشنِ شاداب نصیب ہو ؎

تھا تخیل جو ہم سفر میرا — آسمان پر ہو گزر میرا
اُڑتا جاتا اور نہ تھا کوئی — جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے — رازِ سربستہ تھا سفر میرا

۱۔ ترجمان القرآن: ج۔۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۲۱۶:۱۷، مطبوعہ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء۔

حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمہیں اِرم کیا ہے — خاتم آرزوئے دیدہ گوش
شاخ طوبیٰ پہ نغمہ زن ہیں طیور — بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیانِ جمیل جام بدست — پینے والوں میں شورِ نوشا نوش
دور جنت سے آنکھ نے دیکھا — ایک تاریک خانہ سردوخموش
طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ — اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر — کرۂ زمہریر ہو روپوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی — حیرت انگیز تھا جوابِ سروش
یہ مقام خنک جہنم ہے — نار سے نور سے ہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے — جن سے لرزاں ہیں مردِ عورت کوش

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

ایک صالح دنیوی زندگی کے لئے خالقِ کائنات کی اَن گنت عنایات وآیات سے مستفید ہونے کے لئے یقین محکم کی فطری طور ترجیحاً بنیادی ضروریات روٹی، کپڑے اور مکان کے ساتھ ساتھ سربلندی وسرفرازی کی اہم اوراشد ضرورت ہے کیونکہ

''انسان تن کر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا۔ جب تک کوئی ایسی چیز اس کے سامنے موجود نہ ہو جو خود اس سے بلند تر ہے وہ کسی بلند چیز کے دیکھنے ہی کے لئے سر اوپر کر سکتا ہے''[1]

یہی بات علامہ اقبالؒ نے بھی کہی ہے جب وہ کہتا ہے، حق کے سامنے سربسجود ہونے سے ہزاروں سجدوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اس چوکھٹ سے اپنا سر اُٹھا کے کتنے باطل

۱۔ غبارِ خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد

درباروں اور دنیوی بادشاہوں اور لہوولعب کی غلامی میں بندۂ خدا اپنے خلیفہ پیکر وجود کو جکڑے۔ کائنات ہست و بود کے خالقِ مطلق کے سامنے کوئی بھی طاقت چلنے والی نہیں۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ حدِ اعتدال سے گزرنے والی قومیں نیست و نابود ہو گئیں اس لئے گمراہی سے ہر دور میں نجات مانگی گئی ہے۔ ایک صالح اور منضبط سماج کے لئے ایک منظم ضابطۂ حیات ناگزیر ہے جس کی بنیادیں فطرت سے کلی طور ہم آہنگ مذہبی عقیدے سے جوڑ کر ہم پر مہربانی کی ہے۔ ہمیں نطق اور شعور و ادراک سے نوازا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم سرتاپا شکر ہو کر اس کی بارگاہ میں تسبیح کناں سجدے میں گریں اور حرکت و عمل کے ذریعہ اپنے فانی وجود کو بکھرنے سے بچا کر لافانی ہونے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ہمارے اعمال نیک ہوں تو اللہ ہمیں اور ہماری منکسرانہ بشری کوششوں کو اعتبار و اقتدار سے ضرور نوازتا ہے۔ اس لئے وادیٔ کشمیر کے ممتاز کشمیری اور اُردو شاعر میر غلام رسول نازکی، شاعرِ عظمت آدم علامہ اقبالؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بجا طور یوں تضمین باندھتے ہیں کہ۔

تجھی نے درس دیا بے عمل غلاموں کو
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد
یہ تیرا فیضِ نظر ہے کہ روزِ محشر تک
کریں گے اہلِ نظر تاز بستیاں آباد

علامہ اقبالؒ شاعر کے اعلیٰ مرتبہ منصب سے مکمل طور واقف تھے اور مسلسل افادی سماجی عمل کے حدی خواں بھی جس کی وجہ سے ان کی نظریں اعلیٰ وارفع سماجی مقصدیت پر جمی رہیں۔ یہاں بھی وہ شکم پرور نہیں بلکہ ایک عظیم روح آگاہ شاعر کی حیثیت سے بلند مقام پر فائز ہیں ۔

حکیم شرق اقبال نام ہے جس کا
ہر ایک پیر وجواں کا امام ہے ساقی

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است
پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت
صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بکف
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را
میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ اُمم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!
مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
میری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ راز درونِ میخانہ

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ظاہر ہے کہ شعر اور فنِ شعر علامہ اقبالؒ کی نظر میں محض تفنن طبع کا وسیلہ نہیں اور نہ ہی عارضی جذباتی اور ہنگامی نوعیت کے خارجی و داخلی محسوسات کو اُنہوں نے اپنی ہمہ جہت تخلیقی کوششوں میں جگہ دی۔ علامہ اقبالؒ نے جو کچھ بھی لکھا، کہا یا محسوس کیا وہ بے مقصد و بے مدعا نہیں۔ اُنہوں نے صحیح معنوں میں زندگی کے ناگزیز حرکی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ادبی، ثقافتی اور مذہبی نقطۂ نظر کو واضح کر کے اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ نصب العین کا تعین کر کے وسیع تر سماجی ابدی مسرتوں کا سامان کیا۔ علامہ اقبالؒ کا زمانہ عالمگیر تبدیلیوں اور دوررس سماجی، سیاسی اور عہد ساز انقلابات کا زمانہ تھا۔ وہ ایک صاحب بصیرت، عصر آگاہ اور نابغۂ روزگار عصر ساز شاعر، مفکر اور مفسر حیات کی حیثیت سے متاثر ضرور ہوئے مگر اُن کے قدم لڑکھڑائے نہیں۔ اُنہیں جو کچھ بھی نامیاتی زندگی سے ہم آہنگ لگا اُسے اپنی تخلیقات میں جگہ دی لیکن اپنی جگہ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ اپنے ارفع و اعلیٰ منزل پہ بصیرت افروز نظریں جمائے۔ وہ نہایت ہی عظیم ترقی پسندیت کے قائل و ترجمان تھے لیکن جدلی مادیت کے بے جا معتقد نہیں کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

وہ بے عملی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں، خودی و خودشناسی و درون بینی کو عملی زندگی کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ غیرت و حمیت، مروّت و محبت، اخوت و آفاقیت اُن کا نصب العین ہے جس سے تادمِ واپسین اُنہوں نے سرمو بھی انحراف نہ کیا۔ نثر ہو یا نظم، مکتوب ہو یا خطبہ، خلوت ہو یا جلوت ہر رنگ میں وہ منزلِ مقبول و مقصود کی طرف محوِ سفر رہے ؎

یہی قانون قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریب نظر ہے سکون وثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی اُن کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی اُنکی تقصیریں
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ طے
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ترے خونِ جگر میں
ماسوائے اللہ کے آگے ہے تکبیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ہر دم دواں پیہم رواں ہے زندگی
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اُس پر حرام
شمع کی طرح جلیں بزم گاہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں
ہر کہ اورا قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافرو زندیق نیست

دل ز سوز آرزو گیرد حیات
غیر حق میرد چو او گیرد حیات
پیہم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

زندگانی سوختن یا ساختن
در گلے تخم دلے انداختن

علامہ اقبالؒ نے فکری سطح پر اُردو شعر و ادب کو ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے ابدی اطمینان و ایقان کے نور سے روحانی مسرت و انبساط کا لافانی اور سدا بہار رنگ بھر دیا جس کا تیکھا پن کبھی نہیں مٹنے والا اور جس کی خوشبو فضائے بسیط کو نہ صرف معطر بلکہ منور بھی کرتی رہے گی۔ اُنہوں نے بدلتے زمانے کو سمجھا، اس کے تقاضوں کو بھانپ لیا۔ مگر اپنے ہم عصر شعراء و ادبا کی کورانہ تقلید کی رو میں نہیں بہے کیونکہ اُنہیں معلوم تھا کہ یہ سیاسی جذباتیت و ہنگامیت زیادہ دیر نہیں ٹکنے والی پھر یہ کہ ان کے تخیل تفکر و تیقین کے تخلیقی سرچشمے قرآن و حدیث سے پھوٹے جس کی بدولت وہ تنگ نظری، موقعہ پرستی، فرقہ واریت اور بے بصیر سیاسی نظریہ پرستی کی رو میں نہیں بہے۔ وہ میدان عمل میں کبھی بھی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جذبہ و مستیٔ عمل غافل نہیں رہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری ہے قصۂ قدیم و جدید
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو زمانے میں

۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی سے خطاب کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا:

''میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کیلئے جو راہِ عمل اختیار کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے''[1]

وسیع تر تناظر میں اقبال کے نظریۂ حیات، ادب و شعر اور بصیرت افروز اجتہادی

۱۔ سرسید اور اقبال: ذہنی ارتباط کے خدوخال، اقبالیات، شمارہ ۱۴، طاہر مسعود، مطبوعہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر کشمیر، ص ۱۱۵

کاوشوں کو بصد عجز و انکساری یوں سمیٹا جا رہا ہے۔

''اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اجتہاد و اعتماد کے ساتھ حکمائے مشرق اور فلاسفہ مغرب کے قدیم و جدید نظریاتِ خرد کو قرآن کے اصولِ دانش کی کسوٹی پر پرکھ کر فکرِ انسانی کے مسلسل ارتقا کا سراغ لگایا ہے اور اس طرح ایک ایسا نظام فکر ترتیب دیا ہے، جو جامع، وسیع، عمیق اور نتیجہ خیز ہے۔ یونان اور روم کے خیالات پر عرب و عجم کی تنقیدات سے یورپ اور امریکہ کے انکشافات و ایجادات تک کا احاطہ کر کے اقبال نے نہایت اہم موضوعات پر انسانی تصورات کی ایک مستند و موثر روداد بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز انداز مرتب کی ہے''[1]

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

کائنات کے داخلی نامیاتی دستورِ حرکت و عمل کے سائنسی ارتقاء کا بھرپور شعوری ادراک اور اُس کی مفکرانہ تخلیقی تفسیر ''رب العالمین'' کے الوہی ارشاد اور ''رحمتہ اللعٰلمین'' کی والہانہ لیکن حقیقت پسندانہ اطاعت میں پوشیدہ ہے۔ یہی وہ عالمگیر اور آفاقی نظریۂ حیات ہے جس کے لئے علامہ اقبالؒ نے مستعار حیاتِ عزیز کے گرانقدر لمحات اور بصیرت افروز تخلیقی رشحات وقف رکھے۔

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۱۔ عبدالمغنی، اقبال کا نظریۂ خودی، ص ۹۷، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۰ء

مترجمہ: ڈاکٹر تسکینہ فاضل

اُردو ادب پر اقبالؔ کے اثرات

اقبال اور اُن کے کارناموں پر لکھنے کا آغاز اُن کی حیات ہی میں ہو چکا تھا اور مرور ایّام کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوتا رہا، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ان کی وفات کے بعد اُن کی شاعری اور فکر کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کر کے اس نابغۂ روزگار کے کارناموں کی قدر سنجی کی جاتی رہی تو غلط نہ ہوگا۔ اقبال پر لکھنے والوں میں اُن کے معاصرین بھی شامل ہیں، جن کی اقبالیاتی تحریریں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض معاصرین اقبال کی تحریروں میں وہ تنقیدی بصیرت نہیں ملتی جو رحلتِ اقبال کے بعد اُن کے کارناموں پر قرار واقعی غور و فکر کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ سر عبدالقادر اور اقبال کے وہ معاصر ادیب ہیں جنہیں اقبال کو بہ چشم خود دیکھنے اور اُن کا ہمدمِ دیرینہ اور مخلص دوست ہونے کا شرف حاصل رہا ہے، اقبال سے اُن کے نہایت خوشگوار مراسم رہے ہیں اور دونوں نے یورپ میں کچھ وقت ساتھ گذارا ہے۔ سر عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' میں موصوف کے اصرار سے اقبال کی پہلی نظم ''ہمالہ'' شائع ہو کر قبول عام حاصل کر گئی۔ مذکورہ رسالہ میں اقبال کا کلام سر عبدالقادر کے شذرات کے ساتھ سالہا سال شائع ہوتا رہا اور اس طرح اقبال کو علمی اور ادبی حلقوں میں پہلے پہل متعارف اور روشناس کرانے میں مدیر ''مخزن'' کا اہم رول رہا ہے۔ موصوف نے اقبال پر کئی مضامین اُردو اور انگریزی میں تحریر کئے ہیں جو بعض مؤقر رسائل اور وقیع کتابوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اُن کا ایک ایسا ہی مضمون انگریزی میں The Influence of Iqbal on Urdu Literature" کے زیر عنوان پاکستان سے شائع ہونے والے بزمِ

اقبال کے سہ ماہی انگریزی مجلّہ "Iqbal" میں جولائی، ستمبر ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا تھا۔ اگر چہ اس مضمون میں پیش کیے گئے سر عبدالقادر کے بعض خیالات سے اختلافِ رائے کی بھی گنجائش ہے تاہم اس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، چنانچہ ذیل میں اس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے اُردو ادب کے اُفق پر ایک روشن ستارے کا طلوع ہوا جس نے چالیس سال کی طویل مدت تک اپنے بیش بہا کارناموں کی بدولت اپنا ایک مخصوص اور منفرد مقام حاصل کیا، اس جہانِ فانی سے اپریل ۱۹۳۸ء کو رحلت کر گیا، اس روشن ستارے کا نام نامی ڈاکٹر سر محمد اقبال تھا۔ چوبیس سال کے سن میں اُنہیں پہلی مرتبہ اُردو کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ مدت العمر علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اُن کی اُردو منظومات نے، جنہیں بعد میں ''بانگِ درا'' کے نام سے شائع کیا گیا، اُنہیں ہندوستان بھر میں دور دور تک شہرت عطا کی۔ فارسی زبان میں اپنی استعداد کے جوہر دکھانے کا راز جب اُن پر آشکار ہوا تو ان کی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' نے اُن کی شہرت کو نہ صرف ہندوستان تک محدود رکھا بلکہ ہندوستان کی سرحدوں کو پار کر کے کافی دور دور تک پھیلا دیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر رینالڈ، اے، نکلسن کے اسرارِ خودی کے ترجمے مع حواشی نے اقبال کو مغرب کے علماء اور فضلاء سے روشناس کرایا۔ اسرارِ خودی کے بعد اقبال نے اس مثنوی کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' کے نام سے لکھا۔ بعد میں اُن کی ایک اور فارسی تصنیف ''پیامِ مشرق'' جو مغرب کے حکیم اور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے، منظر عام پر آئی۔ فارسی ہی میں اُن کی دو اور تصانیف زبورِ عجم اور جاوید نامہ ہیں۔ فارسی زبان میں اپنے افکار و خیالات کی ترسیل اور ابلاغ میں انہماک کے دوران ادھر شیدایانِ اُردو کی جانب سے مطالبے بڑھنے لگے کہ اقبال اُردو میں مزید کچھ لکھیں جس کے نتیجے میں بال جبریل اور ضربِ کلیم جیسی دو تصانیف کے ذریعے سے اُردو کے شایقین کے مطالبے کو پورا کیا گیا۔ ان دونوں تصانیف میں اسرار خودی (خودی کی قوتوں کے ارتقاء) کے موضوع کا اعادہ کیا گیا ہے اور یہ موضوع اُن کی تمام فارسی

تصانیف میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی منظومات کا مجموعہ ''ارمغان حجاز'' کے نام سے اُن کے انتقال کے بعد (نومبر ۱۹۳۸ء) ہندوستان میں شائع کیا گیا۔ یہ مجموعہ اگر چہ زیادہ تر اُن کی فارسی منظومات پر مشتمل ہے تاہم اس میں مذہبی نوعیت (جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے) کی چند نظمیں بھی شامل ہیں۔

ہندوستان میں اُردو پڑھنے والے عوام اور فارسی منظومات سمجھنے والوں کے ذہنوں پر اقبال کی شاعری کے اثرات کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے انتقال سے چند ہی ماہ قبل ملک بھر میں اس نابغۂ روزگار شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور اُن کے کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی غرض سے دانشورانہ سطح کے مختلف مراکز پر بڑے بڑے عوامی اجتماعات کا اہتمام کرنے کے لئے ایک اختیاری تحریک چلی تھی۔ چنانچہ اس نوعیت کے سینکڑوں اجتماع منعقد کئے گئے اور ہر اجتماع میں اُن کے کارناموں پر مقالات پڑھے گئے اور اقبال پر لکھی گئی نظمیں سنائی گئیں۔ان میں سے بعض مقالات اور نظموں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے علم میں ہندوستان بھر میں کسی ادبی شخصیت کو اپنی پوری زندگی میں اس طرح کا وسیع خراج پیش نہیں کیا گیا ہے۔اقبال اس معاملے میں عدیم المثال ہیں۔

معاصرین اقبال پر اقبال کے نہایت وسیع اور مختلف نوعیت کے اثرات رہے ہیں۔ یہ اثرات ہیئت کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے بھی موجودہ دور کے ادب پر دیکھے جاسکتے ہیں۔اقبال کی شعری زندگی کے ابتدائی مراحل میں غالبؔ کے پسندیدہ اظہار اور انداز کے علاوہ اُن کے فارسی آمیز فارسی محاورات کو اختیار کرنے کا ایک میلان رہا ہے جب کہ اُن کی زندگی کے اختتام پر اُن کی فکر اور اُن کے مقصد کا تتبع کرنے کی ایک شدید خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔

متحدہ اضلاع میں سب سے پہلے جہاں آباد کے شاعر درگا سہائے سرورؔ اور نادرؔ کاکوروی کو اقبال کے اسلوب کا تتبع کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسرے شعراء نے

بھی اقبال کی ابتدائی نظموں میں درآئی خصوصیات کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اُن سے ایسا نہ ہو پایا۔ اقبال کی نظموں میں اُردو کے ساتھ فارسی محاورات کا ہنرمندانہ استعمال غالبؔ کی مانند ملتا ہے۔ اُن سے یہ مشکل کام اس لئے بن پڑا ہے کیونکہ وہ فارسی کا بخوبی علم رکھتے تھے، اور اس معاملے میں اُنہیں استثنیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم فارسی زبان پر دسترس نہ رکھنے والوں اور سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ اس کے برتاؤ سے واقفیت نہ رکھنے والے شعراء کے یہاں اس اسلوب کی نقل سے بے اطمینانی کے نتائج برآمد ہوئے۔ کثرت سے فارسی اظہارات کے استعمال کا میلان دورِ جدید کی نثر حتیٰ کی صحافتی نثر میں بھی درآیا ہے، تاہم اسے قابلِ ستائش قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ زبان اُردو کو سادہ اور سلیس رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ بہرحال یہ بات یاد رہے کہ اقبال کی اُردو شاعری تمام و کمال فارسی آمیز اسلوب سے مزین اور مکلّف نہ تھی۔ اُن کی کئی بہترین نظمیں سادگی اور سلاست کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، وہ حصے جن میں اُنہوں نے نوجوان سے خطاب فرمایا ہے اور جنہیں بچے اسکولوں اور گھروں میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک ایسی ہی نظم پرندے کی فریاد، کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار سادگی اور تاثیر سے معمور ہیں۔ یہ پنجرے میں قید کئے گئے ایک ایسے پرندے کا گیت (فریاد) ہے جو اپنی کھوئی ہوئی آزادی یاد کر رہا ہے ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

بڑوں کیلئے لکھی گئی نظموں میں سے 'نیا شوالہ' جس میں ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دی گئی ہے، سادہ اور سلیس اُردو کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس نظم کے اختتامیہ اشعار سادہ ہندی پر اقبال کی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں، کہتے ہیں ؎

ہر صبح اُٹھ کے گائیں، منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مئے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے — دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال کی بعد میں کہی ہوئی بہت سی نظمیں اظہار کی سادگی اور فکر کی بلند پروازی کا امتزاج ہیں۔ ''بالِ جبریل'' کی نظم ''ساقی نامہ'' میں اس کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

مغرب کی شاعری اور فلسفے کے وسیع مطالعے کے نتیجے میں اقبال کو اپنی نظموں کے لئے متعدد موضوعات کی بنیاد فراہم ہوئی اور اس طرح یہ کئی نوجوان لکھنے والوں کے لئے موجب تحریک بنی۔ اس ضمن میں ہمارے شعراء کی فہرست میں سب سے زیادہ جس ہر دلعزیز شاعر کی خدمات قابلِ ذکر ہیں، وہ ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں، حفیظ کا اسلوب اگرچہ اقبال کے اسلوب سے بہت مختلف ہے لیکن اُن کے منتخبہ کئی موضوعات کی مثالیں اقبال کے ابتدائی کلام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اور یہ موضوعات اُنہیں کلام اقبال کے مطالعے کے نتیجے میں تجویز ہوئے ہیں۔ انہیں وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہمالہ پر دونوں کی لکھی ہوئی نظموں کو لیا جائے تو یہ دونوں نظمیں اپنی اپنی جگہ عمدہ ہیں یا دریائے راوی پر اگر دونوں کی نظموں کو دیکھا جائے تو دونوں کا ایک ہی موضوع کے تئیں جداگانہ رویہ ہے۔ حفیظ کے مشہور گیت، پریت کا گیت کا عکس اور اصل اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' کے اختتامیہ مصرعوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ایک موضوع جس کی نسبت اقبال کی تحریروں میں جابجا حوالے ملتے ہیں اور جسے شعر وادب میں ایک پسندیدہ موضوع کی حیثیت حاصل ہے، دنیا کے لاکھوں محنت کشوں کے تئیں ہمدردی ہے، غرباء کی تکلیفوں کا تصور کر کے امراء کے خلاف شاعر کے مخالفانہ ذہنی روَیے کی آمادگی اس ہمدردی سے منسلک ہے۔ بال جبریل میں مندرجہ ذیل اشعار فرمانِ خدا فرشتوں کے نام اس اہم سوال کے تئیں اقبال کے روَیے کو ظاہر کرتے ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو کاخ امراء کے درودیوار ہلادو

سلطانیٔ جمہوری کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو
تہذیب نوی کارگہہ شیشہ گراں ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھادو

اقبال کو اپنے عہد کی کئی ادبی شخصیات میں سے اس خیال کے پیرو ملے۔ جب میں گزشتہ سال ایک مختصر دورے پر ہندوستان چلا گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُردو شاعری کے ادبی مقابلوں میں گل و بلبل کے مقابلے میں سرمایہ اور محنت جیسے خشک موضوعات کو اپنایا جارہا ہے۔ پروفیسر تاثیر جو ایک اُبھرتی ہوئی ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کے سرگرم مدّاح اور شیدائی ہیں، اقبال کے کلام کے اس حصے کو، جو اُردو نظموں پر مشتمل ہے اور جن کے ذریعے اُنہوں نے مختلف رسائل میں خدمات انجام دی ہیں، جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایک اور نامور شاعر جوش ملیح آبادی، سرمایہ داری کے خلاف محنت کشوں کے زبردست حامی ہیں۔ اگرچہ اُن کی تحریریں مکمل طور سے دہریت سے مملو ہیں۔ تاہم وہ سرمایہ داری کی حمایت میں نہیں، جب کہ اقبال کا سوشلزم مذہب سے کہیں بھی علیحدگی اختیار نہیں کرتا۔

مذہب کی خاطر دنیا کی ضرورت پر اقبالؔ نے جو زور صرف کیا ہے، اُن کے کارناموں کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس سمت میں بہت سے ادباء اُن کا تتبع کررہے ہیں۔ اُن کے نزدیک مغربی ممالک کے بہت سے مصائب کا سبب مذہب سے برگشتگی ہے، وہ اقوامِ مشرق سے مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو روحانی ارتقاء کو بھی ذہن میں رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ بحیثیت ایک مسلمان وہ اپنے مذہب اسلام سے تحریک حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں در آئی ہوئی مذہبی اصطلاحات خالص اسلامی ہیں۔ اپنے ملک کے نوجوانوں کو اُنہوں نے گہرے طور پر متاثر کیا ہے اور وہ مغربی تعلیم کے مادی رجحانات کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کرچکے ہیں۔

اقبال نے ہمیں خودی کے موضوع پر دعوتِ فکر دی ہے، اس پر ان کی مخصوص چھاپ ہے۔ خودی کے لغوی معنی عرفان نفس یا تعین ذات کے ہیں، تاہم اقبال نے اس اصطلاح

کو وسیع معناں عطا کئے، وہ انسان کے نور مطلق کا حصہ ہونے میں یقین رکھتے ہیں۔ جو پوری کائنات کو منور کر دیتا ہے۔ انسان کی ذات میں اُسی طرح بے پناہ استعداد یا صلاحیتیں موجود ہیں جس طرح ایک چھوٹے سے بیج میں ایک بڑے درخت کو تشکیل دینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اُس پر اپنی ذات، اپنے خالق اور اپنے گردوپیش کے تئیں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی اس قوت کو ارتقاء اور قوت بخشے کہ وہ انسانیت کی خیر اور فلاح کے لئے بروئے کار لائی جائے۔ اس خیال کو ذیل کے اشعار میں بڑے حسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

خودی، اس کے مفہوم اور ارتقاء کی نسبت تفصیلی گفتگو اس مقالے کے دائرہ کار میں شامل نہیں۔ اس کے مطالعے کے خواہاں قارئین حضرات کو اقبال کی فارسی مثنوی اسرارِ خودی یا اس کے مترجم پروفیسر نکلسن کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ Secrets of the Self کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاعر کی رائے یا نظریئے سے متعلق اُن کے مجموعہ کلام اُردو ''ضربِ کلیم'' سے چند اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

جس بندۂ حق کی خودی ہوگئی بیدار شمشیر کی مانند ہے برندہ و برّاق
اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق
اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

(بیداری)

''ضربِ کلیم'' ہی میں ایک دوسرے مقام پر اقبال قاری سے یوں مخاطب ہیں۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے سنجر وطغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد نہنگِ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

(خودی کی زندگی)

اقبال فرد اور قوم دونوں کے حق میں مسلک خود انحصاری اور تہذیبی ارتقاء کی تلقین کرتے ہیں۔ جب اولاً اُنہوں نے اس خیال پر زور دیا تو اُن کے ناقدین میں سے کسی نے اسے جرمن حکیم نطشے کے مطالعے سے اخذ قرار دیا۔ اقبال بلاشبہ حکیم نطشے سے مانوس تھے اور کسی حد تک اُن سے متاثر بھی رہے ہوں گے، لیکن اُنہوں نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ اُن کے اور جرمن حکیم کے مابین فرق یہ ہے کہ میرے نزدیک خودی ذات خداوندی پر یقین کے نتیجے میں مرتبہ کمال کو پہنچائی جاسکتی ہے جب کہ جرمن فلسفی نطشے کے یہاں خودی کے ارتقاء میں خدا کی ذات پر یقن کا پہلو سرے سے عنقا ہے۔

کلامِ اقبال کے اس رُخ یا جہت نے نوجوانوں کے ذہنوں پر بالعموم اور مسلمان نوجوانوں پر بالخصوص کافی دوررس اثرات ثبت کئے ہیں۔ اس موضوع پر اسکولوں اور کالجوں میں مضامین تحریر کئے جاچکے ہیں اور اخبارات و جرائد میں بھی اس پر مقالات لکھے گئے ہیں۔

اس دارِ فانی سے اقبال کی رحلت سے پیدا شدہ دُکھ اور صدمے نے اُن کے کارناموں کے مطالعے اور اُن کے پسندیدہ موضوع پر کام کرنے کا ایک نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ بعض شیدایانِ اقبال کے ہاتھوں اُن کے مرزبوم سیالکوٹ میں حال ہی میں ایک ادارے کا قیام کالج کے نام سے عمل میں آیا ہے تاکہ اقبال کے کارناموں کا مطالعہ کرنے والوں کو باقاعدہ ہدایت دی جاسکے۔ مجھے توقع ہے کہ اس کالج کی قرار واقعی حوصلہ افزائی کی جائے اور یہی اقبال کے تئیں مناسب خراجِ عقیدت ہوگا۔ اس مقالے کو اختتام تک پہنچانے سے پیشتر میں اقبال کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت کا ذکر کرنا چاہوں گا اور وہ ہے مغربی تہذیب پر اُن کی تنقید۔ مغرب میں تعلیم کے حصول اور وہاں کے فلسفے اور ادب کے مطالعے کے باوجود وہ نہ صرف ایک مشرقی بلکہ مشرق کی بہترین روایات پر نازاں بھی رہے۔ اُنہوں نے کئی مقامات پر خود کو شاعرِ مشرق قرار دیا ہے۔ وہ تہذیبِ حاضر کی چمک دمک سے ہرگز متاثر نہ تھے، چنانچہ مشرقی عوام کو اس کی ظاہری کشش کی طرف مائل نہ

ہونے سے آگاہ کیا ہے۔ اُنہوں نے مغربی عوام کو مذہب سے بیگانہ اور برگشتہ تہذیب کی ہوس اور اُن کی جسمانی نشوونما پر اس کے زہریلے اثرات سے بھی خبردار کیا ہے۔ فکرِ اقبال کی اس نہج نے اُردو شعروادب کے بہت سے پیروؤں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

اُردو ادب پر کئی اعتبار سے اقبال کے اثرات کے پیشِ نظر میرے خیال میں اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ اقبال نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اُردو دُنیا سدا اُس کی مرہونِ منت رہے گی کیونکہ اُن کی بدولت اُردو فکر و اظہار کے اعتبار سے مالا مال ہوئی۔

☆

سید محمد فضل اللہ

اقبال اور تصورِ ولایت

ایک مطالعہ

حکیم الامت، شاعرِ مشرق، علامہ اقبالؒ، گوناگوں مضامین کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی ذات اور خون میں شعر کی گرمی، احساس اور پورا ترنم لئے تھے مگر ''ادب برائے ادب'' اور ادب برائے زندگی کی گتھیوں میں پڑنے کے بغیر انہوں نے اپنے لائحہ عمل کا ایک خط کھینچا، جہاں یہ موضوعات سورج کے سامنے یخ کی طرح پگھلتے نظر آتے ہیں۔ وہ کچھ بحثی کے قائل نہ تھے، وہ اپنے قاری کو مضراب حجت پر بلند کرنے کے بھی قابل نہ تھے۔ لیکن اُن کے پاس ایک منشور تھا اور وہ یہ کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اسی لئے علامہ نے مقصدِ ملت کے لئے قوسِ قزح کے رنگوں کے مرقع کی طرح اپنی شاعری میں مختلف رنگین اور روح پرور مضامین اکٹھا کئے۔ چونکہ اس وجہ سے ان کی جلالی شاعری میں اسلامی شاعری کی پوری جمالیات عیاں ہے۔ ان مضامین میں توحید، رسالت، امامت، قیامت، ملت، قیادت، قرآن، ملائکہ اور تعمیر فرد و قوم کے سب زوردار ایجنڈا ہیں۔

یہ عنوان ایک وسیع الجہت بحث کا سرنامہ ہے، جس میں شاعر اور اس کا ایک ہمہ گیر، اہم تر وسعتِ معانی سے لبریز تصور آتا ہے۔ یہ ولایت کا تصور کیا ہے؟ ولایت ماخذ مولا سے نکلا ہوا تصور اور ہمہ جہت موضوع ہے۔ مولا کا لفظ قرآن کریم میں بھی اکیس مقامات پر آیا ہے اور اس کثرت الجہت لفظ سے آشنائی ہوتی ہے اور قاری اقبالؔ کی دانشورانہ مرتبت

سے متعارف ہوتا ہے۔

مولا کے بحر کی شناوری کرتے کرتے انسان ولایت کے صفاتی اور مشتقی حسن سے متعارف، متاثر اور ہم کلام ہوجاتا ہے۔ عربی زبان سے یہاں احتیاج کی وجہ سے اُن کی جہات کی طرف اڑان کی ضرورت ہے۔ جو اس موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ولی، مولا، اولیاء، ولایت، اولی الامر وغیرہ سب ہم رشتہ الفاظ ہیں۔ اگر ولی کا مطلب دوست ہے تو سرپرست بھی ہے، آقا بھی ہے، حمایتی بھی ہے اور کسی کی جان پر صاحبِ اختیار بھی ہے۔

سب سے عظیم دوست اللہ ہی ہوسکتا ہے۔ سب سے عظیم سرپرست اور سرپرستوں کا سرپرست صرف اللہ ہی ہوسکتا ہے، تقدیس کی اس اقلیم میں استحصال، کسی کو نیچا دکھانے اور خواہ مخواہ کی حکمرانی نہیں۔ یہ تو حقیقی آقا کا سوال ہے، اس کی بادشاہت کا معاملہ ہے تو حقیقی دوست بھی وہی ہوسکتا ہے جو استحصال، سرنگوئی رعایا و استعماریت سے بَری بادشاہ کی تاجداری ہے۔

یہی شے اس کو بہترین دوست بناتی ہے، اعتراف ہے کہ دوستی اور حکمرانی کے انتقالِ اختیار میں بہترین آقا اور دوست کے بعد اُن اشخاص کا حق ہے جو روئے زمین پر ساکن ہیں۔ بشروں میں سکونت کرتے ہیں۔ مگر انوارِ رحمانی اور علم الوہی سے مزین ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر بس کر ملاءِ اعلیٰ کے وارث ہوتے ہیں۔ یہ اختیار کہ وہ سرپرستی اور حقیقی دوستی کا اختیار رو بہ عمل لا سکتے ہیں۔ خود اعلیٰ ترین آقا اور دوست نے ان کو دیا ہے۔ خود رب مجید نے قرآن مجید کے سورہ مبارکہ مائدہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ، والذین اٰمنو الذین یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔

(اے ایمان والو! تمہارے سرپرست (حاکم) خدا اور رسولؐ ہیں۔ اور وہ مومنین جو نماز پڑھتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو شخص خدا، اس کے رسولؐ اور مومنوں کی ولایت تسلیم کرے

گا اور اس رشتہ کا لحاظ رکھے گا وہ ہمیشہ کامیاب و کامران ہوگا اور ایسے لوگ تمام گروپوں پر غالب آجائیں گے۔ لفظ ولایت حکم (Rule) کے معنی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور ولی نصیر، اولی امر، سرپرست، بہتر مستحق مالک وغیرہ کے ہم معنی توجہات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ لفظ اتنی ہمہ گیریت کا خزانہ ہے کہ خود خدائے بحر و بر نے اپنے لئے اس کو اپنایا ہے، اپنے آپ کو نبی نہیں بلکہ ولی کہا ہے۔ یہ ارشاد اتنا معظم ہے کہ یداللہ فوق ایدیھم (القرآن) کا افتخار کے ساتھ قرآن کا دعویٰ کرنا قابلِ غور ہے۔ علامہ کہتے ہیں

ولایت، پادشاہی ، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

علامہ اقبال کی شاعری میں ولایت کا موضوع اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ انہوں نے دودھ اور پانی کو الگ کرنے کا سامان کیا۔ انہوں نے ملی جلی روحانی وغیرہ روحانی اقدار و اعتقاد کو لاتلبسوالحق والباطل و تکتموالحق ان کنتم تعلمون کے ماتحت بالکل الگ کرنے کی رائے دی۔ چونکہ علامہ اقبال نہ صرف شاعر، بلکہ وہ عظیم دانشور، مجتہد، عالم دین، طویل قامت عالمِ قانون، مفکر بے بدل اور حکیم الامت تھے۔ اس لئے ہر بات اعتماد کے ساتھ کہی، انوارِ قرآن کے بحر میں شناوری کر کے اسرار کے مطالب بتائے اور فاقۂ بے زمام کو بچھڑی ہوئی قطار کے ساتھ ملا دینے کا عزم کیا۔

اسلام میں تصوف کا دور دورہ چلا، اولیاء کرام بہت آئے۔ اس کا مقصد ایک اکائی میں اور تفریق و انتشار پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ جسے جو نظریہ بھایا وہ اختیار کیا۔ مگر جڑ سے علیحدگی اختیار نہیں کی کہ دائرہ اسلام سے الگ ہوتے۔ اولیاء انوارِ الٰہی میں سوچتے گئے، ربانی نور میں نہائے، خورشید معجزات کی شعاعیں خود میں سرایت کیں تو معجزات و کرامات دکھاتے بھی گئے۔ تلاوت قرآنِ کریم میں وہ لو لگائی کہ کبھی محسوس کیا کہ زبانِ خدا سے سماعت کر رہے ہیں۔ کبھی زبان نبیؐ سے اور کبھی زبانِ جبرئیل سے سننے کا انہیں گماں ہوتا تھا۔ انہوں نے

اپنی ضیاپاشی سے قلوب کو منور کرلیا۔

مگر تصوف نے بھی عشقِ الٰہی کو شعار بنایا۔ پرسکون اختیارِ مسلک کیا۔ سکون کے جھرنے پھوٹ دئے۔ مگر کئی صوفیہ شطحات کہہ گئے اور شطحیات سے اسلام عزیز کو زک پہنچائی۔ اقبال نے ان سے کنارہ کشی کی اور ولایت کے اصول سے اسلام کی نشر واشاعت کو شعار بنایا۔ وہ عمل کا تعین کیا اور قوم کے لئے ایک لائحہ عمل چھوڑا۔ اس ہدایت کے آبشار میں ایک مومن کی تصویر اُبھر گئی جو ولایت خدا اور رسولؐ سے اپنی دنیا تعمیر کرے اور اپنے سوزِ دروں سے فقیری میں امیری وحاکمی کرے۔ فرماتے ہیں ؎

بسوز د مومن از سوزِ وجودش
کشود ہر چہ بستد از کشودش
جلالِ کبریائی در قیامش
جمالِ بندگی اندر سجودش
چہ پرسی از نماز عاشقانہ
کہ عشق چوں سجودش مجرمانہ
تب و تاب یکے اللہ اکبر
نہ گنجد در نماز پنجگانہ

☆

سید مجید اندرابی

چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

(۔۔۔باقیات اقبال کے حوالے سے)

شاعر مشرق کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی کتابیں اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دے دی گئیں۔ ان کتابوں میں ڈاکٹر صاحب کی تلاوت کے قرآنی نسخے کے علاوہ متنوع کتب، رسائل، جرائد، مخطوطات و دیگر دستاویزات شامل تھیں۔ سوال یہ ہے کہ انتقال کے وقت کیا اقبال نے اپنی آرزوؤں وتمناؤں کی تکمیل کی تھی؟ کیا علمی میدان کے اس شہسوار نے رختِ سفر باندھنے کے وقت سے اختتامِ سفر تک جملہ علمی مراحل طے کئے تھے؟ آخری عمر میں علامہ اقبال ایک خاص مشن کی آرزو لئے جی رہے تھے۔ قرآن مقدس کا وہ نسخہ جس کی تلاوت کے دوران اکثر اوقات دردومحبت اور سوز وگداز کا یہ حال رہتا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، روتے جاتے اور پڑھتے جاتے تھے یہاں تک کہ کتاب مقدس کے ورق بھیگ جاتے۔ جب تلاوت ختم ہوجاتی تو اسے اٹھا کر دھوپ میں رکھ دیتے تاکہ صفحے خشک ہوجائیں۔ عمر طبعی کی آخری منزل تک ان کا یہی دستور رہا حتیٰ کہ زندگی کے آخری دنوں میں جب بیماری کا سلسلہ بڑھتا گیا اور گلا خراب ہوجانے کی وجہ سے آواز بگڑ گئی تو اطباء کی ہدایت پر آپ کا یہ طریق تلاوت بھی چھوٹ گیا جس کا ان کو بدرجہ اتم افسوس تھا۔ عمر طبعی کی اس آخری منزل میں اقبال حق ادائی کا فریضہ کیسے اور کس طرح سے ادا کرنا چاہتے تھے؟ جس کا ان کو شدت کے ساتھ احساس تھا۔ جس کی کسک انہیں مضطرب و بے چین کئے دیتی تھی۔ دراصل آخری عمر میں وہ ایک کتاب قرآن مجید پر لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اور اس طرح میرے لئے ممکن ہوسکتا تھا کہ میں قرآن کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیرِ غور ہیں لیکن نہ معلوم اب تو کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں صَرف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں۔ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا''۔

یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ جب اقبال ضعیف العمری کی دہلیز پر قدم رکھے ہوئے تھے۔ ان کی صرف یہی ایک آرزو نہیں تھی۔ اگرچہ مقدم آرزو فقط یہی تھی۔ وہ اس تمنا کی تکمیل سے توشۂ آخرت تیار کرنے کے آرزو مند تھے۔ علاوہ ازیں بھولی بسری صحبتوں کو یکجا کرنے، باقیات غیر مطبوعہ اشعار یا فراموش شدہ واقعات یا تحریرات کی اصلاح و ترمیم و شیرازہ بندی کے بھی شدت کے ساتھ آرزو مند تھے چنانچہ یہ الفاظ ان کی دلی تمنا کے آئینہ دار ہیں۔۔۔

چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔ تا کہ کوتاہیوں کا کفارہ ہو سکے۔ بعینہٖ اسی طرح سے وہ متفرقہ افکار و خیالات، منتشر شذرات اور غیر مطبوعہ اشعار کے علاوہ اخبارات، رسائل و جرائد کے تراشے وقتاً فوقتاً چھپے ہوئے نوادرات و ملفوظات کے علاوہ شاعری کے ایک وافر ذخیرہ کی از سرِ نو اصلاح و شیرازہ بندی کے خواہش مند بھی تھے۔ جس کا بیڑا بعد میں آنے والے شیدایان اقبال نے اٹھایا اور اس کام کو منطقی انجام تک پہنچانے کی ٹھان لی۔

نہ یہ دلی کی اُردو ہے، نہ یہ یورپ کی بولی ہے
زبان میری ہے اے اقبال! بولی دردمندوں کی[1]

فکر اقبال کی تہہ تک جانے کے لئے پُر مغز کاسۂ سر چاہیے۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے تحقیق و تشریح کے نام پر جو تحریریں سامنے آئی ہیں ان میں توازن کی بسا اوقات کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ محقق تعاویلات وتوجیہات کے تانے بانے میں اس طرح خیالات کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہے کہ اصلیت سے کوسوں دور رہ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی وسعتِ فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ مختلف اوقات میں مختلف حضرات اپنے اپنے مخصوص نظریات یا وقتی مصلحتوں کے تحت اقبال کی من بھاتی تشریح کر کے فکر اقبال سے سند حاصل کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں آراء افراط وتفریط کی یوں شکار ہوئیں کہ اقبال فہمی متضاد تصورات اور متناقص نظریات کا ایک گورکھ دھندہ بن کر رہی گئی، ہر شخص نے ہر موقع کے لئے اقبال کو استعمال کرنا چاہا یوں کہ حکیم الامت کو اس طرح پیش کرتے رہے کہ ان کی ہوائیں بندھی رہیں۔ وقت آن پڑا ہے کہ علامہ اقبال کے سنجیدہ قاری، محقق یا ناقد کی سب سے بڑی ضرورت علامہ کے افکار کی تشریح کے برعکس متضاد و متناقص آرا کے مخمصے سے دامن بچانا ہے، تشریح وتوضیح تو بہت ہو چکی اب اس تشریح وتوضیح کی اغلاط اور تضادات دور کرنے اور کم علمی پر مبنی تعصّبات کے جالے صاف کرنے کا وقت آ گیا ہے یا یوں کہئے کہ نئے گوشوں کو سر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اقبال کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کا تعین محض چند گنے چنے پہلوؤں سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا دائرہ اپنے تاریخی، تہذیبی، معاشرتی حوادثوں کی مدد سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ باقیات اقبال کے فکری، فنی و شعری نظام کا شرح و بسط کے ساتھ مطالعہ کرنے سے بھی نئے نرالے گوشوں تک رسائی کے امکانات تلاش کئے جا سکتے ہیں اور افکارِ اقبال کی جہات کا احاطہ کرنے کی راہ بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔ باقیات کوئی obselete یا متروک العمل کلام نہیں۔ یہ وہ کارآمد شاعری ہے

۱۔ منسوخ یا متروک

جس میں چند ایک خامیوں کے آمیزوں کو چھوڑ کر خیالات کی ندرت، افکار کی بلندی اور جذبات واحساسات نیز معانی کی فراوانی کا ایک حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ قاری ایک دم اقبال کی اقبال مندی کا دائرہ سر کرنے میں جٹ جاتا ہے اور اُسے نئے مسائل و امکانات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہی اس سحر طراز کلام کی دلربائی کا حال ہے۔ مگر حوادث زمانہ ان فراموش شدہ صحبتوں کو Revive کرنے میں مانع ہوئے۔ یہاں تک کہ اقبال کے زمانہ میں اس پر کام ہونے نہیں پایا اور بعد کے ادیبوں و نقادوں نے اس باقی ماندہ کلام کی شیرازہ بندی میں حق ادا کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ سید عبدالواحد معینی اپنی کتاب جو باقیات کے جمع وتدوین کی ایک کامیاب کوشش ہے، میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کے پیش گفتار میں فرماتے ہیں۔

> ''آج مرحوم (یعنی سر عبدالقادر) کی آخری خواہش کے مطابق یہ مجموعہ عقیدت مندانِ اقبال کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ میرے لئے تو حضرت اقبال کے متعلق کوئی بھی تصنیف، تالیف یا ترتیب سرمایۂ زندگی ہے۔
>
> عشق شور انگیز زاہر جادہ در کوئی تو برد
>
> بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد
>
> میں کسی حد تک مجموعے کی خامیوں سے واقف ہونے کے باعث اب تک اس کی اشاعت میں پس وپیش کرتا رہا ہوں اور شاید اب بھی پس وپیش کرتا، مگر اقبال کے بے شمار شیدائیوں اور میرے کرم فرماؤں کے تقاضے حد سے بڑھنے لگے ہیں، اور مزید برآں اس سلسلے میں جب مجھے سر عبدالقادر مرحوم کے زبردست تقاضے کا خیال آتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت میں مزید تعویق قطعاً مناسب نہیں۔''

۲۵ یا ۲۶ برس کی عمر تو بہر حال تخلیقی شروعات کا ہی زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں کہی ہوئی نظمیں اور غزلیں اقبال کے عین شباب میں ہی شاعر اقبال کی شاعرانہ عظمت کی آئینہ دار نہیں۔ یہ ان کی تخلیقیت اور خلاقانہ ذہنیت کو منظر عام پر لانیکی پہلی کڑی ہے۔ یہیں سے انہوں نے شاعری کی دہلیز پر قدم رکھ کر اپنے تخلیقی سفر کے منازل متعین کئے۔ اس سفر میں کہیں ٹھوکریں بھی کھانا پڑیں۔ کہیں کہیں حوادث زمانہ اور زندگی کے نشیب و فراز نے انہیں جذباتی بنایا اور کہیں بادمخالف نے ان کے قلب و ذہن کو مرتعش کر دیا۔ کبھی کبھار ایسے مواقع آئے کہ انہیں کسی موضوع پر کہنے کی جسارت تو ہوئی مگر بادِ مخالف آڑے آیا اور حذف و اضافہ سے کام لینا پڑا۔ کسی زمانے میں قومیت و وطنیت کے آئینے میں ہی بات کرتے رہے اور وقت آنے پر چند ایک خیالات و نظریات کو صرف نظر کرنا پڑا۔ اس طرح سے زندگی کے مراحل طے کرتے کرتے اقبال پختہ کار شاعر بن گئے۔ اور ان کے وصال کے بعد دھیرے دھیرے ان کی غیر مطبوعہ یا فراموش شدہ یا متروک کلام نے جس میں ان کی غزلیں، نظمیں اور مکتوبات شامل ہیں، نے باقیات اقبال کا نام پا کر فن پاروں کی شکل اختیار کی۔ اس مہم کو سر کرنے اور اس عظیم کام کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لئے شیدایان اقبال نے وقت وقت پر لامتناہی کوششیں کیں۔ انہی ان تھک کوششوں کے دوران وہ نامعلوم گوشوں، بھولی بسری صحبتوں اور گم نام بیاضوں تک پہنچے۔ دشوار گزار راستوں سے سفر طے کر کے بالآخر ان انمول موتی جمع کئے۔ ایک زمانے میں خدائے سخن مرزا اسد اللہ خان غالب نے جب اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا اور یہ لکھ دیا تھا کہ مرزا کے سوا کوئی مرزا کے نام پر اس کا کلام پیش کرے تو ہرگز میرا کلام نہ سمجھا جائے۔ یہ بشری تقاضے ہوتے ہیں۔ اس وصیت پر اگر من و عن عمل کیا جاتا تو مرزا کا بیشتر کلام اشاعت و طباعت کی منزلوں سے گزرنے کے بجائے حوادثِ زمانہ کی نذر ہو جاتا۔ مگر ان کے دلدادگان نے اُن کے بعد اس کام کو اچھی طرح سے سنبھالا اور تکمیل کی منزل تک پہنچا کر ہی اطمینان کی سانس لے لی۔ انہوں نے غالبؔ کا ایک ایک رقعہ تلاش کیا اور شائع کیا۔ اس تلاش میں وہ نسخہ بھی

دستیاب ہوا جو مرزا نے ہدیتاً بھوپال کے فوجدار خان کو پیش کیا تھا۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی ہے کہ شیدایان اقبال جن میں عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی، پروفیسر گیان چند جین، غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری، فقیر سید وحیدالدین، عبدالغفار شکیل، محمد انور خان اور عبداللطیف اعظمی وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں، نے باقیات کو یکجا کرنے اور اس کی شیرازہ بندی میں جو حق ادا کیا قابلِ صد تحسین کوشش ہے۔ یہ ان کی اقبال شناسی و اقبال فہمی کے علاوہ اقبال دوستی کی بین دلیل ہے کہ انہوں نے اس مہم کو سر کرنے میں فراخدلانہ کوششیں کیں جو بارآور ثابت ہوئیں۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ اقبال کو اگر اپنے ہی زمانے میں متفرق مشاغل سے فرصت ملتی اور اس کی طرف ظن چلا جاتا تو شاید اس کلام کا بیشتر حصہ ان کی زندگی کے دوران ہی طباعت و اشاعت کی منزلوں سے گزر جاتا اور منظر عام پر آچکا ہوتا۔ مگر ہر کام منشائے ایزدی کے تابع ہوتا ہے لہٰذا وہی صورت حال اس کلام کی بھی ہوئی۔ منشا یہی تھا کہ اس کلام کے جمع اور شائع کرنے کی سعادت معینی و گیان چند جی کے علاوہ کئی اہل قلم و اہل ذوق حضرات کی قسمت میں تھی۔ اس میں ان کی مقبولیت کا رازہ مضمر تھا کہ انہوں نے ایسا نادر و تاریخ ساز کام انجام دیا جو نوشتۂ دیوار ہو کے رہ گیا۔ ان کی کاوشیں واقعی قابل ستائش ہیں۔

اقبال کے منسوخ کلام کے حوالے سے پروفیسر گیان چند جین اپنی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال'' کے حرف ثانی میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

> ''ہر تخلیق کار خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنی تخلیقات میں اصلاح و ترمیم کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اشاعت سے پہلے یہ روش عام ہے۔ شاذ اشاعت کے بعد مختلف ایڈیشنوں میں بھی اس کے شواہد نظر آجاتے ہیں۔ اقبال کی شعری تخلیقات بیشتر صورتوں میں پہلے رسالوں میں شائع ہوئیں بعد میں انہیں مجموعوں میں مدون کیا گیا۔

رسالوں کی جو نظمیں اور غزلیں اصلاح سے نہیں سنور سکتی تھیں انہیں
یک قلم مسترد کر دیا گیا۔''

آگے چل کر پروفیسر موصوف اقبال کی فراخدلی وخلاقانہ ذہنیت نیز عبقریت کی داد دیتے ہوئے رقم کرتے ہیں۔

''اُردو کے بڑے شعراء میں غالب اور اقبال ہی ایسے ہیں جنہوں نے اپنے کلام پر اس سختی سے نظر ڈالی کہ جتنا باقی رکھا تقریباً اُسی قدر منسوخ کر دیا۔ اولاد معنوی کو سپردِ عدم کرنا دل پر پتھر رکھ کر ہی ممکن ہے۔ اقبال نے کتنی جگر داری کے ساتھ یہ قربانی کی''۔

اقبال کی کشمیر کے تئیں ایک والہانہ وابستگی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ کئی ایک جگہوں پر ان کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہیں انہوں نے اسے ''تجلی گہہ مولائے جلیل'' کے لقب سے یاد کیا اور کہیں ''خیابان جنت کشمیر'' کے الفاظ سے یاد کیا۔ غرض وادیٔ گلپوش سے ان کی گہری وابستگی ایک مسلمہ امر ہے۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی پہلی نشست فروری ۱۸۹۶ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں اقبال کی شرکت ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مجلس میں اقبال نے اپنی نظم ''فلاح قوم'' پڑھ کر سنائی۔ جس میں کشمیریت کا برملا اظہار نمایاں تھا۔ نظم پڑھ کر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے خود کو کشمیری قوم سے وابستہ کیا ہے۔ اقبال نے اسی دوران کم وبیش نو اقتباسات پڑھ کر سنائے جو سبھی کشمیر سے متعلق تھے۔ بعد میں ان سب کو خارج کر دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ان میں قومیت علاقائیت، یا Regionalism کا شائبہ ہے۔

دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تاقیامت ہو!
ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتون
جو دوڑ کے لئے میدانِ علم میں جائیں
سبوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اُسے بھی باندھ لے اقبال! صورتِ مضمون

''انجمن حمایت اسلام'' کے ساتھ بھی اقبال کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے اہتمام سے سال میں درجنوں دینی، ادبی و شعری محافل ہوا کرتی تھیں۔ جن میں اقبال بھی اکثر اوقات شرکت کرتے تھے۔ یہ انجمن ایک فلاحی ادارہ تھا۔ جس کی نگرانی میں یتیم اور نادار لوگوں کی نگہداشت ہوتی تھی۔ لہٰذا اقبال اس ادارہ کی پذیرائی کرتے تھے۔ اور مشاعرے کی مجلسوں میں شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ مرّوکات میں نہایت لمبی نظمیں وہ ہیں جو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھی گئیں اور ان نظموں نے قبول عام بھی حاصل کیا۔ مثال کے طور پر 'درد دل، نالۂ یتیم'، 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے' ابر گہربار'، یا 'فریاد امت' وغیرہ نظمیں انجمن کی ہی نشستوں میں پڑھی جا چکی تھیں۔ جہاں تک شاعرانہ تقطیع کا تعلق ہے نالۂ یتیم میں کوئی ثقل نہیں۔ اس کے جملہ فنی لوازمات مثال کے طور پر ساکن و متحرک، عروض و بحر، ردیف و قوافی، وزن یا شعری آہنگ وغیرہ شاعری کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ غرض فنی اعتبار سے ''نالۂ یتیم'' میں کوئی سقم نہیں دکھائی دیتا۔ اس کے باوجود بھی اس کی منسوخی عمل میں آئی۔ شاید موضوعی و معنوی اعتبار سے اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ یتیم کی خاطر در در کی خاک چھاننا ان کے لئے چندہ مانگنا اور وہ بھی حضور اقدسؐ کی زبانی، شاید اقبال کو عزت نفس اور مومنانہ غیرت کے منافی دکھائی دیا۔ لہٰذا اس نظم کو متروک گردانا۔ انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں ۱۹۰۰ء کو نمازِ عصر کے بعد اقبال نے یہ دردانگیز نظم پڑھی۔ اس اجلاس کی صدارت شمس العلماء مولٰینا نذیر احمد کر رہے تھے۔ شمس العلماء نے اس نظم کی داد دی اور معتبر شاعروں کے کلام کے مقابلے میں اس نظم کو ایک شاہکار نظم کا درجہ دیا۔ اس کی پذیرائی میں کوئی کسر چھوڑ کے نہ رکھی۔ بایں ہمہ زمانے کے الٹ پھیر نے اس کو متروک کلام کی جھولی میں ڈال دیا۔ لیکن بعد میں متروکات کی شیرازہ بندی کے طفیل یہ نظم منظر عام پر آنے کے علاوہ موضوع بحث بھی بنی۔

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنا دل نہیں
بجھ گئی جب شمع روشن درخورِ محفل نہیں

عینِ طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی
صبح پیری کی مگر بن کر یتیمی آ گئی
یاد ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی
شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی
دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے
زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے
یا محمدؐ کہہ کے اُٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکین اسے ملتی ہے تیرے نام سے
وہ پناہِ دینِ حق وہ دامنِ غارِ حرا
جو تیرے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا

اقبال لسان الغیب خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کو افلاطونی فلسفہ کا پرستار گردانتے ہیں اور انہیں شدید تنقید کا ہدف بناتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں حافظ مے خواری، چنگ و رباب نیم خوابیدگی، مستی اور دین بیزاری کی تعلیم دیتے ہیں۔ جس سے قوائے حیات مضمحل ہو کے رہ جاتے ہیں۔ وہ ان کے کلام کو عجمی ادبیات کا نمونہ سمجھ کر متروک العمل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں ۳۵ ایسے اشعار ہیں جن میں حافظ شیرازی کو زبردست تنقید کا ہدف بنایا گیا ہے۔ اس مثنوی کی پہلی ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں صوفیا و عجمی فلاسفہ کا ایک کاروان ان کے خلاف ہو گیا اور اپنے والد کے مشورے پہ قابل اعتراض حصے کو حذف کرنا پڑا۔ اس طرح سے حذف شدہ اشعار متروکات میں شامل ہو گئے۔ غرض اصلاح و ترمیم و حذف و اضافہ کے زیر و بم میں ساز و سوز کا دھارا بدلتا

گیا۔ یہاں تک کہ پختہ راگ الاپنے کی باری آ گئی اور کلامِ اقبال ایک مستقل و دل آویز فن کی صورت اختیار کر گیا۔ اسرار کے چند حذف شدہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوشیار از حافظِ صبہا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
مفتی اقلیم او مینا بدوش
محتسب ممنونِ پیرے مے فروش
بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

اسی طرح الحذر از گوسفندان۔ الحذر وغیرہ تیز طرار الفاظ کا اخراج بعد کی سنجیدہ کوششوں کے طفیل ہی عمل میں آ گیا اور بیسیوں ایسے اشعار جو شاملِ کتاب ہو چکے تھے، بعد کی ترامیم نے انہیں منسوخ کروا دیا۔

دلی میں محبوب العالم حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے سامنے کی دیوار پر اقبال کے تین اشعار لکھے ہوئے ہیں ان میں سے دو اشعار نظم ''برگ گل'' کے ہیں اور تیسرا ''التجائے مسافر'' کا یہ شعر ہے۔

ستارے عشق کے، تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت، نظام ہے تیرا

''التجائے مسافر'' بانگ درا میں موجود ہے۔ یہ نظم رسالہ ''مخزن'' اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ نظم کے شان نزول میں مولینا غلام بھیک نیرنگ کے خیالات کافی دل چسپ ہیں۔ یورپ جانے کے لئے اقبال ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ اُن کی معیت میں غلام بھیک نیرنگ اور خواجہ شیخ محمد اکرم آئے تھے۔ اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد نے ان کا استقبال کیا۔ یہ سب منشی نذر محمد کے گھر میں ٹھہرے اور دیر گئے تک باتیں کرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر چلے گئے۔ اقبال نے اپنے دوستوں سے باہر

رہنے کو کہا اور خود اندر چلے گئے۔ مزار کے سرہانے بیٹھے اور اشک بار آنکھوں میں ''التجائے مسافر'' پڑھی۔ اس کے بعد اقبال تادیر حالت استغراق میں چلے گئے۔ ہوش سنبھالا تو سب چلنے کو اُٹھے۔ اقبال نے وجدانی کیفیت میں مرزا غالب کے مزار پر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ وجدانی عالم میں آواز گونجی۔

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

التجائے مسافر کے کم و بیش پندرہ اشعار بعد میں حذف کئے گئے۔ ان میں سے درج ذیل اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

تیرے وجود سے روشن ہے راہ منزلِ عشق
دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا
خروشِ میکدۂ شوق ہے ترے دم سے
طلب ہو حضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا
کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مرید پیر نجف ہے غلام ہے تیرا

اشک بار آنکھوں سے راہِ حق کے مسافر نے کاشانۂ نظام الدین اولیاء کو وداع کہا اور عازم سفرِ یورپ ہوئے۔ پیامِ مشرق کے متفرق اشعار میں کئی بند قابل ذکر ہیں۔ نمونہ کے طور پر جو دو اشعار درجہ ذیل پیش کئے دیتا ہوں، فنی محاسن سے مملو ہیں۔

زمانہ پیش نگاہم گذشت و می گذرد
چو سرو خیمہ ہستی کنار جو ازدہ ام
دل تپیدہ کہ صبح ازل مرا بخشید
زبر گرفتہ و بازش بروئے او زدہ ام

اقبال عمر طبعی کی آخری منزل تک پہنچنے کے ساتھ ہی ایک پختہ کار، عشق رسول سے سرشار،

خلقِ عظیم کے پرستار، شیدائی حیدر کرار، پاسدارِ سرخیل احرار اور میدانِ عمل کے شہسوار بن گئے تھے۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل کا زمانہ ان کی ہمہ جہت ترقی کی معراج کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب متاع فقیر صرف اور صرف قرآن مقدس اور عشق رسول تھا۔ اب اقبال ہستی سے عدم تک کی منزل کی طرف رواں دواں تھے اور تزک و احتشام سے دنیوی زندگی کو خیر باد کرنے کے قلبی آرزومند تھے۔ کیونکہ مستعار زندگی کی تکمیل کے بعد وہ معشوقِ ایزدی کی ملاقات کے بے تابی کے ساتھ منتظر تھے۔ چنانچہ باقیات کے اس شعر سے بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

متاع قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولے تو لب نہ کشائی کہ یار ما عربی است

یہ پُر کیف منظر انہیں دنیائے دوں سے پرے کسی روحانی جولاں گاہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ فرشتۂ آسمانی نے برآمدے پہ دستک دی اور اس طرح سے لاہور میں قیام کے دوران بیسویں صدی کے اس نابغہ عصر مردِ قلندر نے تبسم کے ساتھ اپنی جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔

ناگاہ نیلگوں فلک سے آواز آئی
"دگرِ دانائے راز آید کر ناید"

اب حضرت اقبال جہاں فانی سے رخصت ہو رہے تھے۔ شیدایانِ اقبال کی بھاری جمعیت، برصغیر ہند پاک کے عوام و خواص اور عالمِ علم و عمل کے دل دادگاں اس مردِ مجاہد کو نم ناک آنکھوں سے وداع کہہ رہے تھے۔ سراپا سنسان کا ماحول تھا اور اقبال کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے سے قبل ان الفاظ کو دہرا رہی تھی۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہم چناں در اوّل و صفِ تو مانده ایم

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت

علامہ اقبال ایک عظیم المرتبت اسلامی فلسفی شاعر ہونے کے علاوہ عہدِ جدید کے ایک روشن خیال مفکرِ ملت ہیں۔ آپ نے اس دورِ پُر آشوب میں منزل گم گشتہ کی طرف بنی نوع انسان کی رہنمائی ورہبری کرنے کا فریضہ بحسن وخوبی سرانجام دیا۔

آپ نے اپنے تبحر علم و بصیرت، سوز وگداز اور دردوکرب کی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے اسے شعروفن کے قالب میں ڈھال کر ایک طرف نوتراشیدہ بتوں کے چہروں سے نقاب اُتار دیا اور دوسری طرف پوری انسانیت کو خبردار کیا کہ زمانے کے ان نت نئے بتانِ وہم وگمان سے دامن بچا کر اُس امانت کا حق ادا کیا جائے جس کے ساتھ پوری عالمِ انسانیت کی فلاح ونجات وابستہ ہے۔ آپ نے پورے یقین واعتماد کے ساتھ زمانہ کے ہاتھوں ہزار ہا آراستہ کئے ہوئے خودساختہ نظریات کے صنم کدوں کو ایک ضرب کاری سے زمین بوس کر کے انسانیت کی تعمیرِ نو کے لئے ایک پختہ اور مستحکم بنیاد کی نشاندہی کا فریضہ انجام دیا اور واشگاف انداز میں یہ اعلانِ عام کیا کہ ؎

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نہ گزشتم کہ پختہ بنیاد است

دراصل آپ اسلام کے آفاقی پیغامِ امن واتحاد کو سارے عالم میں برپا کرنے کے زبردست متمنی تھے اور آپ کا یہ پیغام امن والفت، آپ کے کلام میں جابجا اس طرح نمایاں ہے۔ جس طرح آفتاب کی کرنوں میں روشنی اور نور۔ علامہ اسلام کو ایک عالم گیر امن ومحبت کی تحریک اور مشن کے طور پر جانتے ہیں۔ یہی تحریک اُن کے خیال میں انسانیت اور

انسان دوسری کا سبق دیتی ہے۔ ملک وملت کے تفرقے مٹاتی ہے، طبقاتی کشمکش کو مسمار کرتی ہے اور انسان کو صحیح معنوں میں انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام تک لے جانا چاہتی ہے۔ علامہ اسی تحریکِ امن عالم کے پیامبر ہیں۔ اُن کی دور بین نظریں یہ مشاہدہ کرتی ہیں کہ انسانیت کا تار و پود بکھر چکا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بے چین و بے قرار ہو رہے ہیں کہ قومی، ملکی اور نسلی تفریق انسانیت کو اندر ہی اندر سے نگل رہی ہے لہٰذا وہ ان زخموں پر مرہم رکھنے کا پیغام دیتے ہوئے درد بھرے لہجے میں ملت سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوت کا بیان ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تو رانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

علامہ اقبالؒ اخوت و محبت اور امنِ عالم کے چراغوں کو روشن کرنے کا پیغام دیتے ہوئے سمجھاتے ہیں کہ اسلام انسان کو بیکراں بنانا چاہتا ہے۔ آپ ملت مسلمہ کو بالخصوص اور انسانیت کو بالعموم اتحاد و اتفاق اور اخوت و محبت کا پیغام دیتے ہوئے ۱۹۰۳ء کے ایک خطبے میں ملت سے یوں گویا ہوتے ہیں:

"Islam is one and indivisible. It brooks no distinction in it. There are no Wahabies. Shias and Sunnis in Islam. Fight not for the interpreations of the truth, when the truth itself is in danger. It is foolish to compalin of stumbling when you walk in the darkness of night. Let all come forward and contribute their respective share in the great toil of the nation. Let the class distinctions and sectarianism be smashed for ever"[1]

1. Iqbal, Islam as a Moral and Political Ideal, S.A. Wahid, 1909, p. 54. New Delhi.

علامہؒ دراصل اتحاد و اتفاق اور امن و صلاح کی درج بالا قدروں کو تمام انسانیت میں عام کرنے کے متمنی تھے۔ انہوں نے واضح طور پر اپنے آخری ایام میں ایک ریڈیائی نشریے میں کہا ہے کہ انسانیت کی بقاء کا راز اس کے احترام میں ہے۔ جب تک نہ تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کریں۔ تب تک یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ گویا عالم انسانیت کو درندگی اور بہیمت سے پاک و صاف کرنا اُن کا سب سے بڑا نصب العین تھا۔ اسی لئے وہ اپنے فکر و عمل کو صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ اپنے نورِ بصیرت سے تمام انسانیت کو منور کرنے کے متمنی تھے۔ البتہ ملت مسلمہ کا خیال اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کیونکہ وہ خود اسی جمعیت سے تعلق رکھتے تھے جس کو صدیوں کے مسلسل انحطاط اور جمود و زوال نے مضمحل کیا ہوا تھا۔ اب اس ملت کی اپنی مخصوص انفرادیت اور اپنا شاندار وقار ختم ہو چکا تھا۔ یہ جمعیت اب تمام دنیا میں مظلوم و مغلوب ہو چکی تھی۔ اسی لئے علامہ کا ایسی ملت مظلومہ کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہونا انسان دوستی کے بنیادی خیال سے قطعاً علیحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ اسی انسان دوستی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ آپ کے نزدیک تمام مشرق کا حال یہی تھا کیونکہ یہ تمام انسان بری طرح پامال کئے گئے تھے لہٰذا وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام مشرق کے متعلق یوں اپنا اظہار خیال کرتے ہیں[1]

تیرہ خاکم را سراپا نور کن
در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بروز آرم شبِ افکار شرق
برفروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایام را

۱۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، شرح از پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۲۱۸، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

دراصل علامہ مرحوم کو مسلمان، ہندوستان (برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش) اور افغانستان ومشرق سب کی پامالی ومظلومی کا شدید کرب واحساس تھا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر جو دست درازیاں ہوتی رہیں وہ ان سے بے حد مغموم و نالاں تھے کیونکہ انسانیت کے علمبردار کی حیثیت سے وہ ان دست درازیوں کو انسانیت اور انسان دوستی کے بنیادی اصولوں کے بالکل منافی سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ مظلوم ومقہور اقوام وافراد کے حق میں بغیر کسی تفریق کے اپنی آوازِ حق کو بلند کرتے تھے البتہ اُن کے عقیدے کے مطابق یہ بلندی و سرفرازی انہیں اسلامی نظامِ حیات کے آفاقی اصولوں کو بروئے کار لاکر ہی نصیب ہوسکتی ہے۔ اُن کے خیال میں اسلامی اصول ہی انسان دوستی اور انسانیت کے اصولوں سے حد درجہ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وسیع علمی وتاریخی مطالعے کے بعد یہی اخذ کیا کہ اسلام ہی نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل کئے ہیں اور صحیح اسلامی نظام اقدار میں وہ طبقاتی کشمکش اور آویزش کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا ہے جس نے ساری انسانیت کو آج ہنگاموں اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنادیا ہے۔ اسی لئے آپ نے دنیا کے تمام خود ساختہ نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے۔

''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہوسکتی ہے''

۱۷، اکتوبر ۱۹۲۶ء کو آپ ایک دوست کے نام اپنے مکتوب میں بڑی دردمندی کے ساتھ اپنا یہ اظہار خیال کھل کر بیان کرتے ہیں:

''سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا''

۲۴، جون ۱۹۲۳ء کو ایڈیٹرز میندار کے نام ایک مکتوب میں علامہ یوں رقمطراز ہیں:

''میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک (Communist) تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے''

اسی لئے تو علامہ نے فرمایا ہے ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

غرض علامہ اقبال نے تمام خود ساختہ نظریاتِ حیات کو رد کرتے ہوئے اپنے نورِ بصیرت سے انسانیت کی زبوں حالی اور اضمحلالی کا علاج اسلامی نظریہ حیات کے عملانے ہی میں مضمر قرار دیا ہے اور اُن کا یہ نظریہ زمانۂ سلف سے جڑا ہوا ہے جو بالکل اُن محدود اور تنگ نظر مذہب پرستوں کے برعکس ہے جنہوں نے مختلف ادوار میں مذہبی فرقہ بندیوں سے انسانیت اور اسلام کو مجروح کیا ہے۔ اسی لئے آپ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں اسلامی نظریہ حیات کی توسیع اور حرکی (dynamic) تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society based on such a conception of reality must reconcile, in its life, the permanance and

change. It must possess eternal principles to regulate its collective life, for the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are undderstood to exclude all possibilities of change which according to the Quran is one of the greatest 'signs' of Allah, tend to immobalise what is essentially mobile in its nature"[1]

یہاں علامہ نے مدلل انداز میں اسلامی حرکی نظام کی توضیح کرتے ہوئے انسانیت کو اس نظامِ رحمت سے روشناس کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلام میں انسانی اتحاد کی بنیاد مادی، نسلی اور جغرافیائی حدود کے بجائے روحانی ہے۔ اسلامی تہذیب ایک اللہ کے عقیدہ پر استوار ہے اور عقیدۂ توحید تو پوری انسانیت کو اللہ کی غلامی میں لاتا ہے۔ یہ روحانی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔ اس لئے علامہ کے مطابق توحید پر عمل پیرا ہونا عینِ فطرت انسانی ہے۔ لہٰذا اللہ سے وفاداری گویا انسان کی اپنی ہی مثالی فطرت سے وفاداری ہے۔ اسلام نے حقائق عظیمہ کے اس نصب العین پر مبنی جو معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ اس کے کاروبار زندگی میں لازماً دوام وتغیر کے مطالبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی اور دونوں کے تقاضے پورے ہوگئے۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ترتیب کے لئے ابدی اصول ہیں جو پیہم تغیر پذیر کائنات میں قدم جمانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں لیکن جب یہی اصول تغیر کے تمام امکانات کو خارج کردیں تو آیات الٰہی بھی جس کائنات کو متحرک قرار دیتی ہے لازماً جمود سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔ علامہ یورپ جاکر یورپ کے جدید طریقۂ حیات اور طرزِ فکر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ اس تہذیب وتمدن کی اساس خالص مادیت پر مبنی ہے۔ یورپ کے لوگ مادہ پرست بن کر مذہب سے بالکل نابلد ہوچکے تھے لہٰذا اقبالؒ اُن کی زندگی میں مذہب اور اخلاقیات کی غیر موجودگی کو دیکھ کر دل برداشتہ ہوگئے اور انہوں نے

---

1. The Reconstruction of Religious Thought in Islam byS.M. Iqbal, Adam Publishers and Distributors Delhi, 1997, pp. 134-135.

برملا طور پر اپنے اس عقیدے و عمل کا یوں اظہار کیا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

مغرب کے جدید علوم و فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی سے آپ مرعوب نہ ہوئے بلکہ اس کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ جدید علوم و فنون ظاہر میں تابناک اور روشن تو ضرور ہیں لیکن حقیقت اس کی روشن نہیں ہے کیونکہ مغرب انسانی عظمت اور روحانی رفعت سے بالکل بے بہرہ اور لاپرواہے۔ اسی لئے فرمایا ؎

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

دراصل مغرب اور مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف علامہ کے درج بالا اعتراضات صرف جذباتی نہیں بلکہ ان میں ایک بین فکری حقیقت کارفرما ہے تاہم مجموعی طور سے آپ محض ناقد نہیں معترف بھی ہیں اور اُن کی تنقید اور اعتراف دونوں کی ایک خاص معنویت ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔ آپ واضح طور پر ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے ہر شب کو سحر کر

یا دوسری جگہ آپ زیادہ واضح انداز میں فرماتے ہیں ؎

خرد افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحبِ نظراں

یا

مے از میخانۂ مغرب چشیدم
بہ جان من کہ درد سر خریدم

اس سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ علامہ کی تنقید محض احتجاجی اور جذباتی نوعیت

کی نہیں ہوتی بلکہ بعض مخالفانہ محرکات کے باوجود ایک وسیع دردمندانہ اخلاقی نقطۂ نظر اور ایک بڑے ملی نصب العین کے تابع تھی۔ مغربی تہذیب وتمدن اور علم کے معاملے میں ہی آپ ایک اور جگہ ملت مسلمہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

عصر حاضر زادۂ ایام تست
مستیٔ او از مئے گلفام تست
شارح اسرار او تو بود
اولیں معمارِ او تو بود

یعنی آج کل جو سائنسی ریل پیل مغرب میں جاری ہے اس کے اولین معمار تو مسلمان ہی ہیں۔ آپ مسلمانوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے مسلمان ملت آپ ہی نے دنیا کو تہذیب وتمدن کا سبق سکھایا۔ اس کے معمار اول تو آپ ہی ہیں۔ اسی لئے آپ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانیت کی نشاۃ ثانیہ چاہتے ہیں تاکہ ایک اور بار یہ سسکتی ہوئی انسانیت اعلیٰ اخلاقی قدروں کو بحال کر سکے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال ہمیں خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل کیجئے کیونکہ عالمِ بیداری میں انہوں نے یہ ہم سے ہی لیا ہے۔ اُن کے رقص وسرود اور لادینی وفحش گوئی میں اُن کی ترقی کا راز مضمر نہیں ہے بلکہ اُن کے علم وفن میں اُن کا عروج مضمر ہے۔ اسی حقیقت کو آپ بہترین انداز میں یوں شعری پیرایہ پہناتے ہیں۔ ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست
نے ز عریاں ساق ونے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خط لاطینی است

قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

اس سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ علامہ نے مغربی علم وفن کے جن چشموں سے سیرابی کی ہے اُن کا ذکر انہوں نے بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے کیا ہے۔ اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود آپ نے مغربی علوم کا ذکر ایک طالب علمانہ خلوص سے کیا ہے۔ اس کی ایک روشن مثال ہمیں اُن کی "The Reconstruction...." میں بھی نظر آتی ہے۔ جس میں وہ واضح انداز میں کہتے ہیں:

"The task before the modern Muslim is therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past.... The only course open to us is to approach modern knowledge with a respectiful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that knowledge, even if we may be led to differ from those who have gone before us"[1]

اُن کے نزدیک ایک مسلمان کو لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُسے مودبانہ انداز میں اپنے تمام علمی اثاثے کی چھان بین کر کے دورِ حاضر میں اسلامی نصب العین کو اپنا کر روشن خیال، جواں فکر اور ایک حرکی مسلمان کی حیثیت سے خود بھی زندہ رہنا چاہیے اور دوسروں کو بھی اسی طرح زندہ و پائندہ رہنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ اسی روشن مستقبل کے لئے آپ دورِ حاضر کے انسان کو پکارتے ہوئے کہتے ہیں ؎

---

1. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, 4th lecture, by S.M. Iqbal, Adam Publishers and Distributors Delhi, 1997, pp. 87-88

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

علامہؒ کی اسی خصوصیت کی وجہ سے مرحوم ملک الشعراء بہارؔ آپ کے متعلق یوں لطب اللسان ہیں۔

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت

یعنی دورِ حاضر علامہ اقبال کا دور ہے۔

محمد اعجاز اشرف شاہ
ریسرچ اسکالر اقبال انسٹی ٹیوٹ

فکرِ اقبال میں تصورِ شعر

یوں تو مختلف شاعروں نے فن کے بارے میں اپنے تصورات و نظریات کا اظہار کیا ہے لیکن یہ نظریات اکثر موقعوں پر محض خیالات پریشان ہیں اور ان سے کسی مخصوص تصور کی تشکیل نہیں ہوتی۔ لیکن اقبال کے یہاں شعر یا نثر میں فنِ شاعری سے متعلق تصور ایک خاص پس منظر بھی رکھتا ہے، ایک نظام فکر یا فلسفہ بھی اور ساتھ ہی خود شاعر کے یہاں اس کا عملی مظاہرہ بھی ہوا ہے اور تنقید میں اقبال کے ساتھ جو شعری نظریہ منسوب ہوا ہے وہ بہت حد تک یک رخا ہے۔ مثلاً اقبالیات کے مطالعہ میں زیادہ تو زور اس بات پر رہا ہے کہ اقبال کے یہاں شاعری محض ایک ذریعہ ہے ان افکار کو دوسروں تک منتقل کرنے کا جو مفکر اقبال نے پیش کئے ہیں۔ اس صورت میں اقبال کے تصور شعر میں محض موضوع اور خیال کی اہمیت باقی رہ جاتی ہے اور لفظ و پیکر محض وہ لبادہ جسے مضمون کو سمجھنے کے بعد بیکار کی چیز سمجھ کر پھینک دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اقبال کی نظم و نثر کا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ تجربے اور اظہاری پیکر کے ربط باہم کی اہمیت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کے قائل بھی تھے۔ سکندر علی وجہ کے نام اپنے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں عام طور پر ادبا کو زمانۂ حال کے فن تنقید کے اصولوں سے واقفیت حاصل نہیں۔ اس واسطے یہ بھی مفید ہوگا کہ آپ انگریزی میں چند مشہور اور مستند کتابیں پڑھیں۔ ان کے طرزِ بیان اور اندازِ تنقید سے آگاہی حاصل کریں۔ اگر آپ ان کے اصولوں اور ان کے

اسالیب بیان کو اختیار کر سکیں تو بجائے خود اردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔[1]

اس اعتبار سے اقبال شاعری کی جمالیاتی قدر سے ناواقف نہیں تھے بلکہ رموزِ فن سے مکمل طور آگاہ تھے۔ تخلیق فن کا مکمل شعور رکھتے تھے۔ مضمون کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا اور اسلوب کی نادرہ کاری کی اہمیت کے بھی قائل تھے۔ وہ بلند پایہ اور اعلیٰ فن کا واضح تصور رکھتے تھے۔ واقعہ نویسی پر رمزیہ اور استعاراتی طرزِ بیان کو ترجیح اور منطقی صداقتوں پر شعری صداقتوں کو فوقیت دینے کی اہمیت سے واقف تھے۔ اس سلسلے میں اقبال نے اس شعر میں بطورِ خاص اشارہ کیا ہے۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایمانیست

شعری حقیقت کو منطقی حقیقت پر ترجیح دینے کا یہ عمل تخلیقی ذہن کا لازمہ ہے چنانچہ اقبال بھی مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے پیرائے میں کرنے کے روادار ہیں۔ فلسفہ جیسا سنگلاخ میدان بھی اسی وجہ سے شاعری کے آئینے میں زرخیز نظر آتا ہے اور اپنی تروتازگی سے متاثر کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اقبال شاعری کی لسانی بنیادوں کا بھی شعور رکھتے ہیں اور فنون لطیفہ کی حیثیت سے اس کی جمالیاتی قدر کا بھی علم رکھتے ہیں۔ وہ لطفِ گویائی اور کمالِ گویائی کی اگر توصیف و تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ شاعری اظہار کا ایک بہترین وسیلہ ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس وسیلے کی عمدگی محض اس کے منظوم ہونے میں نہیں ہے۔ یہ اظہار کی ایک بلند بلکہ بلندترین صورت اسی لئے ہے کہ یہاں اظہار ایک تخلیقی پیرایہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسا پیرایہ جو معنی کے ہزار امکانات رکھتا ہے اور اس کے باعث

ہر وقت توانا، طاقتور اور تازہ دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ ہر طرح کی فکر اور نوع کا تجربہ نثری استدلال کے پیرائے میں پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعری کے قالب میں اور عمدہ شاعری کے قالب میں ہر نوع، ہر حجم اور ہر رنگ کا تجربہ یا مضمون ڈھل جاتا ہے اور اپنی تاثیر کے امکانات کو دوبالا پاتا ہے۔ غرض اقبال شاعری میں محض موضوع اور مضمون یا خیال اور تجربے کو ہی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس صورت یا ہیئت اور لسانی شکل کو بھی اہم گردانتے ہیں جو موضوع و مضمون کی حامل ہو۔ تاہم اس بحث کا سب سے بڑا پہلو وہ ہے جو شاعری کی اہمیت، اس کی ماہیت تاثیر نیز سماج کے ساتھ اس کے رشتے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی نثر اور شاعری، دونوں میں جابجا حوالے ایسے مل جاتے ہیں جو ان کے تصور شعر کو ہیئت پرستوں کے نظریئے سے الگ اور ممتاز بنا دیتے ہیں۔ یہ حوالے یا تو شاعری کے بارے میں راست بیانی پر مبنی ہیں یا پھر خود اقبال کی اپنی شاعری کے تعلق سے ان کے تاثرات اور خیالات، آرزوؤں اور تمناؤں یا پھر دعووں پر مبنی ہیں۔

اس بات کا تذکرہ پہلے ہی ہو چکا ہے کہ اقبال کا تصور شعر (یا تصور فن) ان کے فلسفۂ حیات سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ان کی شاعری کی قدر سنجی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اقبال کے نظام فکر میں شخصیت کی تعمیر پر زور اساسی اہمیت کا حامل ہے۔ تعمیر خودی کا فلسفہ بھی اپنی بنیاد اسی میں رکھتا ہے اور فرد اور معاشرے دونوں کو محیط ہے۔ شخصیت کی تعمیر کے لئے دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ شاعری کا بھی ایک کردار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری ایک تخلیقی سرگرمی ہے، اظہار کا ایک ذریعہ ہے لیکن تخلیق اور اظہار بھی جہاں معمولی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں وہیں انہیں اعلیٰ اور ارفع تر مقاصد کے لئے بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ پس اگر انسان یا باشعور فرد ذات اور معاشرے دونوں سطحوں پر شخصیت کی تعمیر کا خواہاں ہو تو اس کے نزدیک شاعری کیوں کر اس منصب سے دستبردار قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کا

مطلب یہ نہیں کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے بے شمار شاعروں نے تخیل کی دنیائیں آباد کر کے، حسن کی توصیف و تخلیق کر کے نفسیاتی و جبلی خواہشات کو زبان عطا کر کے یا پھر تفنن طبع کا سامان بہم کر کے شاعروں کی صورت میں بالکل بے مصرف اور بے کار سی شے کو جنم دیا ہے۔ ان ساری چیزوں کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ ان کی تہہ تک جانے سے انسانی زندگی کے رموز و اسرار کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کے تئیں شاعروں کے ردّ عمل کا بھی عرفان حاصل ہو جاتا یا ہو سکتا ہے لیکن اس کے مضر اثرات سے اپنا دامن بچانا بھی ممکن نہیں ہے۔۔ اس دور اور معاشرے میں کہ جو حرکت و عمل، بیداری، امید، یقین، خواب اور جستجو کا تقاضا کرتا ہو بے عملی، مجہولیت، احساس کی پژمردگی، اضمحلال اور مایوسی سراسر منفی قدریں ہیں اور اگر شاعری میں اس نوع کی قدریں راہ پا جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری اپنے دور کی زمین میں جڑیں نہیں رکھتی، اپنے ماحول سے ہم رشتہ نہیں، اس لئے محض مصنع، فریب، فرار کی صورت اور بے وقت کی راگنی ہے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ شاعر معاشرے میں حد درجہ حساس ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔ معاشرے کے بے حد حساس، خلاق، اظہار پر وقادر اور باشعور فرد کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو فرد اور معاشرے کی بہترین اور بھلائی کے لئے صرف کرے، دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ قوت کا کوئی بھی تصور خیر کی شرط سے مستثنیٰ نہیں۔ یہی محاسبہ قوت کو حسن بنا دیتا ہے۔ ورنہ شر کی قوت شر کو کبھی خیر سے عظیم نہیں بنا دیتی۔ شاعر کے پاس اگر قوت ہے تو اس کا حسن خیر ہی کے تناظر میں حسن قرار پاتا ہے۔

یہی نظریہ اقبال کے فلسفہ حیات کے راستے سے اقبال کے تصور شعر میں کارفرما ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ شاعر کے بارے میں کہتے ہیں

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن
خیزد از سیمائے او انوار حسن

از نگاہش خوب گرد و خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

فطرت شاعر سراپا جستجوست
خالق و پروردگار آرزو ست
بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش
صد جہانِ تازہ مضمر در دلش

بانگ درا کی نظم ''شاعر'' میں بھی شاعر کو اعضائے جسمِ قوم میں آنکھ کہا ہے جو سب اعضا کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

ظاہر ہے کہ اگر شاعر قوم کے لئے دیدۂ بینا ٹھہرا تو اس کی سرگرمی یعنی شاعری بے مطلب و بے مقصد نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ اقبال کے یہاں شاعری دماغی تفریح یا خیالی انجمن آرائی کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک بامقصد سرگرمی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملّتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشبند عالمے است
شاعری بے سوز و مستی ماتمے است
شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اقبال کے یہاں شاعری کا جو سماجی سروکار یا معاشرتی منصب ملتا ہے اس کا احساس اقبال سے قبل حالؔی اور ان کے بعض معاصرین خصوصاً اکبر کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ محمد حسین آزاد پہلے ہی اردو شاعری کی عشقیہ روایت سے بیزار ہو چکے تھے اور آبِ

حیات میں انہوں نے گھسی پٹی روایت سے اس بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے، یعنی مضامین عاشقانہ، میخواریٔ مستانہ، بے گل وگلزار وہی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصل موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بے زاری۔۔۔ (یہ) مضمون اس قدر مستعمل ہوئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے۔۔۔ حسن وعشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ سو برس کی بڑھیا ہوگئی۔

''۔۔۔ سوچتا ہوں اسے کون دھوئے اور کیوں کر دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کنارے پر قابض ہوگئے ہیں۔ ان کی ہمّت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو نہ فقط دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی''[۲]

مشرق ومغرب، دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض بعد میں اقبال کی ہی شخصیت تھی چنانچہ انہوں نے بھی آزاد، حالی، اکبر اور شبلی کی طرح بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ اردو ادب خصوصاً اردو شاعری پر جو کیفیت طاری ہے وہ مایوسی، بیزاری کی ہے جس میں سے بعض شاعر دم غنیمت شمار کی ترکیب نکال کر عشق و عاشقی کی سطحی بساط پر کام ودہن کی لذت کا لمحاتی کھیل کھیلتے رہے ہیں اور یوں ایک کار بے مصرف میں مشغول رہے ہیں۔ ایسے شاعر اپنے تخلیقی جوہر کی افادیت سے اور اپنی خودی سے غافل ہیں۔ اپنی نظم ''ہنروران ہند'' میں اقبال کہتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

واقعہ یہ ہے کہ اقبال سے قبل حالؔی اور ان کے ہم خیال سخن فہموں سے قطع نظر اردو شاعری کا غالب رنگ یہی تھا جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اس شعری منظر نامے سے بیزاری کا تذکرہ اقبال کے یہاں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جگہ جگہ ملتا ہے۔ وہ شاعری جو محض جسم کی لذتوں کے تذکرے پر مبنی ہو یا محض تفنّن طبع اور تفریح کا ذریعہ ہو، بدن کو تو بیدار کرتی ہو لیکن روح کو خوابیدہ بناتی ہو، فطرت کی خوبصورتی کی گیت تو گاتی ہو لیکن فطرت کے ان اشاروں کے تئیں بے حس ہو جو قوت تسخیر کو لجاتے للچاتے ہیں۔ وہ شاعری اقبال کی نظر میں زوال آمادگی کی علامت ہے اور ایسی شاعری مغز و معنی سے بیگانہ ہو کر ''چھلکے سے، شکل سے'' دلبستگی بڑھائی ہے۔ شاعری خواہ کتنی ہی طربناک اور دلآویز ہو اقبال کی نظر میں تب تک وقیع نہیں ہے جب تک نہ وہ انسان اور انسانی معاشرے کی فلاح و صلاح کے لئے بھی معتبر نہ بن جائے۔ یعنی اقبال کا تصور شعر و ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے مقصد یا ادب برائے زندگی کے دائرے میں آتا ہے۔ شاعری کی قوت اور طاقت سے حالؔی نے بھی خبردار کیا تھا اور اس قوت کو انسانیت اور عظمتِ انسان کے لئے صرف کرنے پر زور دیا تھا۔ اقبال نے ایک منظّم فکر کے تحت شاعری کے لئے جو موقف اختیار کیا وہ یہ تھا کہ

''شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی
زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کے

بجائے افسردگی اور انحطاط کو صحت اور وقت کی تصویر بنا کر دکھا
دے اور اس طور پر قوم کی ہلاکت کی طرف لے جائے''[۳]

اعضائے قوم میں شاعر کو دیدۂ بینا قرار دینے والے اقبال شاعری کو انفرادی سرگرمی کے بجائے قومی، ملی یا اجتماعی زندگی کے لئے محرک کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور یوں اس کے قومی کردار پر زور دیتے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب مشرق سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی نیز روحانی اعتبار سے زوال کا شکار ہو رہا تھا، فارسی اور اردو کے شعراء حقیقت کے تئیں لاتعلقی اور بے حسی کا مظاہرہ کر کے خیالی دنیائیں بسا رہے تھے یا پھر لمحاتی اور عارضی مسرتوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اقبال نے اس صورت حال کا مشاہدہ کیا۔ مشرق اور مغرب دونوں کی تہذیب کا بغور مطالعہ کیا۔ ان اسباب و علل پر تفکر کیا جن کی وجہ سے مشرقی اقوام خصوصاً اسلامی دنیا کو اپنی عظمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے اور سب سے بڑھ کر اس درد کا مداوا بھی تجویز کیا اور ایک ایسا نظریہ فراہم کیا جس کی بناء پر فرد و ملت کی ہمہ گیر ترقی، انسانی زندگی کی بقاء اور عظمت آدم کی بحالی ممکن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ شاعری کو بھی انہوں نے دوسری انسانی سرگرمیوں کی طرح اس نظریے کا پابند تصور کیا۔ کیونکہ اسی صورت میں فرد اور جماعت کا طرز عمل نوع انسانی کے لئے اہم اور بامعنی ہے۔ یوں شاعری اقبال کے خیال میں اپنی جمالیاتی قدر کے باوجود ایک مؤثر وسیلہ اور ذریعہ بھی ہے اور اس موثر وسیلے کے حامل فرد کا سماجی فریضہ خود وسیلے کو بھی سماجی سروکار کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اقبال خود بھی زندگی کے شاعر ہیں اور شعر اور فن کو وہ اس کا خادم جانتے ہیں۔ چنانچہ فن اور زندگی کے رشتے کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں۔

علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

اقبال کی نظر میں فن اور شاعری کا مقصد زندگی کی تاریکیوں کو منور کرنا اور اسے زیادہ سے

زیادہ خوبصورت بنانا ہے۔اس کے دائرہ کار میں فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا اور اسے حیات ابدی کا سوز بخشنا اور اسے انقلاب کی لذتوں سے آشنا کرنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔موسیقی ہو یا مصوری یا پھر شاعری، ان میں اقبال تعمیر خودی کے جوہر کی کمی کے حق میں نہیں۔

گر ہنر میں نہیں خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرور

کیونکہ اقبال کی نظر میں

مقصود ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیسان وہ صدف کیا وہ گہر کیا

اقبال کے فلسفۂ خودی کا ابتدائی نقطہ انسان اور کائنات کے درمیان ایک گہرے اور اٹوٹ رشتے سے شروع ہوتا ہے۔انسان مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرتا اور ان کو مسخر کر کے حیات و کائنات کی تزئین کرنا چاہتا ہے۔جہانِ تازہ کی جستجو اور فکر و عمل کی ندرت و تازگی اس کا ایک بامعنی اور بامقصد مشغلہ ہے۔تخلیقی عمل کی یہ تازہ کاری فنون لطیفہ یا شاعری کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے چنانچہ اقبال اسی لئے شاعری کے فن کو نقالی یا عکاسی نہیں کہتے۔ ان کے نزدیک فن اور حیات کا یہ ربط و تعلق اس سے کہیں زیادہ گہرا، کہیں زیادہ استوار اور بامعنی ہے۔اقبال نے اہرام مصر، مسجد قوت الاسلام اور مسجد قرطبہ کی اس لئے ثنا خوانی کی ہے کہ ان میں سے کوئی تعمیر زندگی کی کوئی بلندی و شکوہ و شان کی اور کوئی حیات کے جلال و جمال کی علامت ہے یہ سنگ و خشت بجائے خود کچھ نہیں بلکہ ان کی تہہ میں فکر انسان کی ندرت اور تازگی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اقبال اُردو اور فارسی شاعری کی روایت سے بے بہرہ نہیں تھے لیکن اس شاعری کی طربنا کی اور ہولنا کی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اقبال نے اس روایت کو توڑنے پر زور دیا۔ اپنے اعصاب پر عورت کو سوار کرنے والے شاعروں کو بے چارہ کہہ کر اقبال اس روایت سے گریز کرتے ہیں جسے وہ شاعری کی عجمی روایت یا عجمی لے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ عجمی لے اقبال کی نظر میں حیات کُش اور بے جان ہے۔ اس میں افسردگی ہے، کھو جانے کا جذبہ ہے، سستی اور کاہلی ہے، مسحور کن جمال ہے جو کسی بھی طرح کے جلال سے بے بہرہ ہے۔ اقبال اس عجمی لے کے بارے میں کہتے ہیں۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی ندا سے ہو گلستان
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

شاعری کی اس عجمی روایت کے فرسودہ اور غیر حرکی عناصر سے گریز کا احساس مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے اور ساتھ ہی اقبال کے نظریۂ شعر کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں شاعروں کی طرح افسانہ گو نہیں ہوں اور نہ ہی حقیقت سے بے بہرہ ہوں۔ میرا موضوعِ سخن کوچۂ محبوب نہیں اور نہ ہی میں آہ وزاری کرنے والوں، غبارِ راہ ہونے والوں اور دلِ بے اختیار رکھنے والوں میں سے ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثال شاعراں افسانہ بستم
بکوئے دلبراں کارے ندارم
دل زارے، غم یارے نہ دارم

نہ خاکِ من غبار رہگزارے
نہ در خاکم دلِ بے اختیارے
نہ جبریل امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و دربان ندارم

انکساری کا لہجہ دراصل اردو فارسی شاعری کی اس روایت پر گہری چوٹ کا درجہ رکھتا ہے جس کی رُو سے شاعری رومانوی افسانہ طرازی کا دوسرا نام بن گئی تھی اور لب و رخسار اور زلف و خال کے دام میں گرفتار تھی۔ اقبال نے اس نوع کی شاعری پر گہرا طنز کیا ہے کیونکہ یہ جمال کی یک رخی تصویر ہے۔ اس کی بھرپور فنی بازیافت نہیں ہے اور نہ ہی اس میں جلال کا حسن شامل ہے۔ اقبال کی نظر میں حسن و جمال اگر جلال سے تہی ہو تو بے تاثیر ہے۔

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

جلال حسن و جمال کو بے حس و حرکت بُت کے بجائے متحرک پیکر بنا دیتا ہے اور حرکت کا یہ عنصر شاعری کو قاری کے لئے یا فرد اور معاشرے کے لئے بامعنی اور موثر بنا دیتا ہے۔ اقبال نے شاعری کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں حرکت و عمل کا تصور اساسی طور پر شامل ہے۔ یہ تصور زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی۔ اس میں حُزن و یاس کے بجائے پرسوزی اور نشاط انگیزی پر زور ہے۔ یہ جنت کو رونے کے بجائے نئی جنت تعمیر کرنے کے لئے اکساتا ہے۔ اقبال اس شاعری کے حق میں نہیں جو ہجر و فراق پر روز و شب کرھتی رہتی ہے۔ قنوطی نظریے کی ترویج کرتی ہے۔ تقدیر کے آگے بے بسی اور لاچارگی کو صحیح ٹھہراتی ہے اور یوں فرد اور معاشرے میں ضعف و اضمحلال پیدا کرتی ہے۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستان
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ نغمہ سردی خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

اقبال کی نظر میں یہ شاعری زوال آمادہ معاشرے کی پیداوار ہوتی ہے جس میں شاعر قوم کو جگانے کے بجائے سلانے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے بجائے انہیں مزید پختہ کرنے کا ایک منفی کام سرانجام دیتے ہیں۔ اس شاعری کے برعکس اقبال ایسی شاعری کی وکالت کرتے ہیں جو زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنے۔ جس میں بلند آہنگی اور بلندیٔ فکر ہو، زندگی کے مسائل کی پرکھ ہو۔ زندگی سے فرار کے بجائے اس سے قربت کرنے کا جذبہ موجود ہو، مشکلات کو دعوت دینے اور اوران پر قابو پانے، صلاحیتوں کا اجاگر کرنے اور انہیں اجتماعی مفاد کے لئے بروئے کار لانے نیز اذہان و افکار میں انقلاب لانے کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ پروفیسر نکلسن کے نام اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''شخصیت یا مسلسل جدوجہد کی حالت انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ جو شئے حقیقت کو مسلسل جدوجہد کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے لہٰذا وہ اچھی ہے۔ اور شئے شخصیت کو کمزور کرے وہ بُری۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے''[۴]

شاعری کی قدر سنجی کا یہ معیار ایسا ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعری کی جمالیات کو محدود تصور کی رُو سے دیکھنے والوں کیلئے اس شعری نظریئے میں بظاہر تشفی بخش سامان نہیں ہے لیکن اقبال نے الگ الگ موقعوں پر نظم و نثر کی صورت

میں شاعری کی فنی اور تخلیقی شان کو بحال رکھنے پر بھی زور دیا ہے۔ شاعری اگر شاعری نہیں ہے تو شاعری کی حیثیت سے اس کے سماجی سروکار پر بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ اقبال جیسا کہ کہا جا چکا ہے شعری اور فنی اقدار، زبان و اسلوب کی عمدگی، استعاروں اور علامتوں کے فن کارانہ استعمال، موسیقی اور ترنم ریزی یا آہنگ کی اہمیت اور دیگر لوازمات سے نہ صرف واقف ہیں اور نہ صرف ان کی نفی نہیں کرتے بلکہ اپنی شاعری میں بھی انہیں کمال فنکاری کے ساتھ برتتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ہیئت پرست نہیں۔ وہ محض لفظوں اور ان کے آہنگ اور فنی کرتب بازیوں میں یقین نہیں رکھتے بلکہ ان حربوں یا فنی نزاکتوں سے جو شاعری ترتیب پاتی ہے اس کی معنوی کائنات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں بنیادی اہمیت بات کی ہے اور اس کے کہنے کا انداز اس کے تابع ہے۔ جبھی تو انہوں نے برہنہ حرف نہ گفتن کو کمال گویائی کہا ہے لیکن جب اس کی وجہ سے اصل بات یعنی معنی و مطلب کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو ایسی صنعت گری سے پرہیز بہتر ہے۔ اسی لئے اقبال رمز و ایما کی اہمیت اور شاعری کے لئے اس کی ناگزیریت کو محسوس کر کے بھی کہتے ہیں۔

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں

یا پھر

شاعر دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

اس اعتبار سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اقبال کے یہاں شاعری اپنی فنی قدروں کے ساتھ ایک سماجی سرگرمی ہے اور اس کا تعلق معنی کی سطح پر فرد اور معاشرے کی زندگی کے ساتھ اس قدر گہرا ہے کہ اکثر و بیشتر یہ معنی پیغام ہی کا دوسرا روپ ہوتے ہیں یعنی اقبال شاعری کو ایک ذاتی شئے نہیں سمجھتے بلکہ اسے معاشرے کی صلاح و فلاح کا ایک موثر اور بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

اقبال کا نظریہ شعر، جو اس بحث سے مترشح ہوتا ہے، خود ان کی اپنی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اقبال نے اسی نظریے کے تحت شعر کہے، غزلیں لکھیں، نظمیں لکھیں اور اسی نظریے کے تحت وہ تخلیقات بھی پیش کیں جو اُردو شاعری میں (اور فارسی شاعری میں بھی) شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی وہ نظریہ شعر ہے جس کی بناء پر اقبال کو پیامی شاعر بھی کہا گیا۔ حکیم الامت بھی اور شاعر مشرق بھی اور یہی وہ نظریہ ہے کہ جو شاعری میں اقبال کی عظمت اور بیسویں صدی میں ان کی دانشوری کی بنیاد بھی ہے۔ اگر وہ اُردو شاعری یا عجمی شاعری کی روایتی لکیر کو پیٹتے رہتے اور مروّجہ شعری نظریئے کو اپناتے تو شاید ان کا رتبہ داغ، جیسے شاعروں سے بلند نہ ہوتا۔ لیکن روایت کی اس فرسودہ زنجیر کو توڑ کر انہوں نے ایک ایسا شعری نظریہ پیش کیا جو آدم گری سے تعلق رکھتا ہے اور فن کے دائمی اقدار کا حامل ہے۔ خود اقبال کی تمام تر شاعری کسی نہ کسی روپ میں آدم گری کا فرض نبھاتی ہے۔ فرد اور معاشرے کی اصلاح کا جوہر رکھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی:

''اقبال کا عقیدہ ہے کہ شاعر کا کام آدمی کو انسان بناتا ہے اور یہ کام اس وقت ہوسکتا ہے جب انسانیت اور شائستگی کے اعلیٰ معیاروں سے وہ شاعر بخوبی واقف ہو۔ ان پر عمل پیرا ہوتا کہ اپنے کردار و گفتار میں وہ انسان گری کے بہترین نمونے پیش کر سکے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ کام ریشیوں، منیوں اور پیغمبروں کا ہوا کرتا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ ہاں شاعری بھی پیغمبری کا ایک جزو ہے۔ شاعر کا کام بھی پیغمبر کی طرح قوم کو سنوارنا ہے۔

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است[۵]

حواشی

۱۔ خطوط اقبال، ص ۱۳۲۔

۲۔ محمد حسین کی آزاد ''آب حیات'' ص۔

۳۔ مقالات اقبال، ص ۱۸۸۔

۴۔ محمد بدیع الزمان، پیام مشرق، ص ۱۸۔

۵۔ نورالحسن ہاشمی، ''ادب کیا ہے'' ص ۵۶۔

سید ایس۔ اقبال قریشی

ازاں مے فشاں قطرۂ برکشیری

علامہ اقبال کا کشمیر اور کشمیریوں سے والہانہ محبت ایک قدرتی بات تھی کیونکہ علامہ کشمیر الاصل تھے۔ یہی حقیقت اس کی بنیاد تھی جس سے علامہ نے کشمیر اور اس کے لوگوں کے لئے زبردست دلچسپی دکھائی اور یہ دلچسپی بہت پہلے سے یعنی طالب علمی کے ہی زمانے سے شروع ہوئی۔ جس میں انہوں نے کشمیر کی سیاسیات، لٹریچر اور تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا۔

> ''کلام اقبال کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی کشمیر کو موضوع سخن بنالیا تھا اور پُر جوش تڑپ، درد اور اُمنگ کا یہ جذبہ عمر کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں میں بڑھتا اور پھیلتا رہا''[1]

علامہ اقبال کی پوری زندگی میں جو غم اُن کی روح و ذہن کو بے قرار کرتا رہا وہ صرف کشمیریوں کی غلامی اور پامالی کا غم تھا۔ وہ اس حد تک تھا کہ جب بھی کوئی کشمیر یا کشمیریوں کے بارے میں کچھ بولتے یا لکھتے تو علامہ اُن کی بات کو غور سے سنتے یا پڑھتے اور اُن اشخاص کی حوصلہ افزائی کرتے۔ مختلف محققین نے متفقہ طور پر اس بات کو تسلیم کیا کہ علامہ کے آباواجداد کا کشمیر سے ہجرت کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ کشمیریوں پر ظلم و جبر اور سیاسی انتشار ہے، چونکہ علامہ اس بات سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اپنے بیشتر کلام میں کشمیریوں کی بے بسی اور پژمردگی کا جگہ جگہ اظہار کیا اور اس کے ساتھ ساتھ علامہ نے کشمیریوں کو بے حسی سے جگانے کے لئے بہت سی جگہوں پر لطیف اشارات دئے ہیں۔

کشمیر پر ایران کے اس قدر اثرات مرتب رہے ہیں کہ اس کو ایران صغیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس بات کا اعتراف علامہ نے بھی اپنی شاعری میں کیا ہے اور جس کے ساتھ ساتھ شخصی راج تلے دبے کشمیریوں کی حالتِ زار پر بھی بہت سی سنجیدگی کے ساتھ

اظہار خیال کیا۔ مثلاً

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر[۲]

علامہ نے کشمیریوں کی دردناک آہیں محسوس کیں اور شخصی راج کا ظلم و جبر دیکھ کر کشمیریوں کی لاچاری کو دور کرنے کے لئے بول اُٹھے۔

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا جب مرعوبِ سلطان و امیر[۳]

اور پھر آگے جا کے علامہ اُس وقت کے دہقانِ کشمیر کی درد بھری زبان میں کہتے ہیں

کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایّام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر[۴]

کشمیریوں کے اوصاف کو بھی علامہ نے زیرِ نظر رکھ کر خداوند تعالیٰ سے آہ وزاری کی۔

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ!
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟[۵]

کشمیریوں کی حالتِ زار دیکھ کر علامہ دست بہ دعا ہوئے۔

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب![۶]

اس شعر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ علامہ کی فکر اس بات کے لئے ہمیشہ مضطرب رہتی تھی کہ کشمیریوں کو ایک ایسا درویش صفت رہنما ملے جو کہ کشمیریوں کو اس چنگل سے چھٹکارا دلا سکے۔ علامہ اس بات سے باخبر تھے اور یہ کہنے سے نہیں کترائے کہ کشمیریوں کی بدقسمتی اور بدحالی کا سبب صرف اور صرف اُن کی ڈوگروں کے ہاتھوں بکنا تھا اور بلا ہچکچاہٹ پکار اُٹھے۔

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی!
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند[۷]

ان اشعار میں علامہ نے کشمیریوں کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ آیا دنیا میں کوئی اتنی بدقسمت قوم ہوسکتی ہے جسے کوڑیوں کے دام بیچا جائے اور دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علامہ نے کشمیریوں کے ضمیر کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری جگہ علامہ نے اُن غیر ذمہ دار اور انسان دشمن عناصر کے لئے بددُعا کی ہے۔

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا[۸]

یہ بات بہت ہی دلچسپ ہے کہ علامہ نے جو پہلی نظموں کا انتخاب اخبارات میں چھپنے کے لئے کیا وہ کشمیر کے ہی متعلق کیا جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ علامہ نے زندگی میں سب سے پہلی اہمیت کشمیر ہی کو دی۔

''اقبال کی جو نظمیں سب سے زیادہ پہلے کسی اخبار یا رسالہ کی زینت ہوئی وہ کشمیر یا کشمیریوں کے متعلق ہی تھیں''[۹]

علامہ نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لئے صرف شاعری سے ہی نہیں کام لیا بلکہ کشمیر کی سیاسیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کشمیریوں کی حق تلفی کے خلاف زبردست تحریری و تقریری احتجاج کیا اور شخصی راج کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے زبردست کاوشیں کیں۔ کلیم اختر نے اپنی کتاب اقبال اور مشاہیر کشمیر میں مولانا عبدالمجید سالکؔ کا بیان شامل کرتے ہوئے اس بات کی عکاسی کی ہے کہ علامہ نے اپنی ذاتی کوششوں سے کشمیریوں کے حقوق کی بحالی میں کتنا کلیدی رول ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کے مخلصانہ تعلقات نواب حمید اللہ خان تاجدار بھوپال

سے تھے اور تاجدار بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے۔ علامہ نے ان کے ذریعے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمیشن مقرر کیا۔ اس وقت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مسلم کانفرس کو گلینسی کمیشن کی ترکیب پر اعتراض تھا۔ چنانچہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاس عاملہ میں مسائل کشمیر کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ کمیشن کے مسلمان ممبروں کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر نامزد کیا گیا۔ لہٰذا یہ کمیشن ناقابلِ قبول ہے۔ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر الرحمٰن کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کمیشن کے سامنے پیش کریں۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کے اسیرانِ بلا کی تکالیف و مصائب اور مسلم وکلاء کے حدود ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا۔ علامہ اقبال کشمیر کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ذریعے سے بھی مسلمانانِ کشمیر کے مسائل اٹھاتے رہے اور اسیرانِ کشمیر کی رہائی پر اصرار کرتے رہے''[۱۰]

اس کے علاوہ علامہ نے بہت سے خطوط کے ذریعے کشمیر کے اُس وقت کے لیڈران کو بیدار ہونے کی تدبیریں بھی سمجھائیں اور اُن سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی تلقین بھی کی۔ مثلاً علامہ نے شیخ محمد عبداللہ کے نام ایک خط میں یوں لکھا:

''مختلف جماعتیں جو سنا ہے کہ بن گئی ہیں اور ان باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل پر بہت بڑی روکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج''[۱۱]

اس بات سے ثابت ہوا کہ اُن کو کشمیر کی حالات پر کتنی کڑی نظر تھی اور قدم قدم پر کشمیریوں کو

رہنمائی کی۔ ۱۹۲۱ء میں جب علامہ سفرِ کشمیر سے واپس روانہ ہوئے تو کشمیریوں کی حالت سے زبردست پریشان رہنے لگے۔ چنانچہ علامہ نے کشمیریوں کو اپنے حقوق کی پامالیوں کی خبر کشمیر اُن دنوں آنے والے برطانوی ہند کے وائس رائے لارڈ ریڈنگ کو دینے کو کہا جو کہ شخصی راج کے خلاف ایک بڑا دھچکہ تھا اور کشمیریوں کی کھوئی ہوئی آزادی کو بحال کرنے کے لئے ایک بہت بڑی کوشش تھی جس سے مہاراجہ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے (اقبال نے) کشمیری لیڈروں کو مشورہ دیا کہ کشمیر میں دورے پر آنے والے وائسرائے ہند کو محضر نامہ پیش کریں جس میں اپنی تکالیف بیان کی جائیں۔ علامہ اقبال کی ایماء پر لاہور ہائی کورٹ کے فاضل جج آغا حیدر نے یہ میمورنڈم لکھا جو معززین کشمیر نے بڑی جرأت سے مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ کی موجودگی میں لارڈ ریڈنگ کو دیا''[۱۲]

پروفیسر عبدالقادر سروری نے علامہ کے کشمیریوں سے ذہنی لگاؤ کو عمدہ انداز میں وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کو کشمیر کے ساتھ نسلی ربط کے علاوہ گہرا ذہنی ربط بھی رہا جہاں وہ کشمیر کے فطری مناظر کے حسن اور اُن کی رعنائی کے گیت گاتے ہیں، اہلِ کشمیر کی مظلومی اور بے بسی پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔ کشمیر کے حسن کو دیکھنے میں اُن کی ژرف بین نظریں عام شاعروں کے روایتی انداز سے متاثر نہیں ہوئیں، چنانچہ کشمیر کے حسن کے روایتی موضوعات، گلمرگ، پہلگام، ڈل یا ولر پر انہوں نے کوئی نظم نہیں لکھی بلکہ کشمیر کی حقیقی زندگی اور اہلِ کشمیر کے بعض بنیادی مسائل اُن کی توجہ کے مرکز رہے، جیسے اُن کی حسنِ فطرت اور اُن کی ذہانت کے باوجود، اُن کی سیاسی بے چارگی اور سماجی پسماندگی پر اقبال کا دل کڑھتا تھا''[۱۳]

کشمیر سے ہجرت کرنے والوں نے کشمیریوں کو بیدار کرانے اور اُن کے حقوق کو

بحال کرانے کی کوشش میں بہت سی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جس میں انجمن کشمیری مسلمانان ہند یا انجمنِ مسلمانانِ لاہور جو کہ کچھ عرصے کے بعد انجمن کشمیری مسلمانان پنجاب میں تبدیل ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں اُس کا احیاء مسلم کشمیری کانفرنس کہلانے لگی جس کے اولین جنرل سیکریٹری خود علامہ اقبال تھے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ کس حد تک کشمیریوں کی سیاست کے معاملے میں پیش پیش رہے۔ یہ انجمن کشمیریوں کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے بہت سے طریقوں سے کام کرتی رہی۔ ڈاکٹر اسد اللہ وانی رقمطراز ہیں:

> ''اقبال کے کشمیریوں کے مسائل سے واقف کرانے اور ان میں دلچسپی لینے کی ترغیب ان کے ہم عصر کشمیری نوجوان منشی محمد دین فوقؔ نے دی جنہیں اقبال نے مجدد الکشامرہ کہا ہے۔ انہوں نے کشمیر اور کشمیریات کے تعلق سے ہمیشہ فوقؔ کی فوقیت تسلیم کی ہے اور اس سلسلے میں ان کی تصانیف اور کوششوں کو کافی سراہا''[۱۴]

علامہ نہ صرف مہاجر کشمیریوں سے رابطہ رکھے تھے بلکہ ہر اُس شخص کے ساتھ جو کہ کشمیری عوام میں بیداری اور اصلاح کا متلاشی تھا۔ مثلاً عبدالصمد کلکرو جن کے بارے میں اسد اللہ وانی لکھتے ہیں:

> ''فوق کی طرح کشمیر کے ایک اور شخص کے ساتھ اقبال کے گہرے مراسم تھے جو کشمیریوں کے لئے اپنے دل میں ایک درد اور تڑپ رکھتے تھے۔ کشمیر کی محبت سے سرشار اس شخص کا نام خواجہ عبدالصمد کلکرو تھا۔ یہ بارہمولہ کشمیر کے رہنے والے تھے جنہوں نے ریاست میں سب سے پہلے اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور اس کا نصب العین اشاعت دین اسلام ٹھہرایا۔ آپ کے تعلقات ملک کے جن مشاہیر کے ساتھ تھے ان میں سے ایک اقبال بھی تھے''[۱۵]

علامہ کشمیریوں کی عزت کو بحال کرانے کے بہت خواہاں تھے اور اُن کی یہ واضح سوچ کہ جب تک کشمیری عوام اپنی غلامی کے مسئلے کی اہمیت کو نہ سمجھتے تب تک اس کا حل ہونا ناممکن ہے اور وہ حل صرف اور صرف تب ہی ہوسکتا ہے جب کشمیری اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور علم کی روشنی سے منور ہوں تا کہ وہ بے بسی سے چھٹکارا پا سکیں۔ اُس وقت کی انجمنوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لئے لٹریچر، میگزین اور اخبارات کی شکل میں مہیا کیا اور یہاں تک کہ وظائف بھی۔

''چنانچہ کشمیریوں کی بیداری کے لئے انجمن نے ۱۸۹۶ء میں ہی ''انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور'' کے نام کا ایک رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۰۰ء میں میاں جان محمد گنائی نے منشی محمد دین فوقؔ کی ادارت میں ایک ہفتہ روزہ کشمیر گزٹ کا اجرا کیا اور پھر فوقؔ نے ۱۹۰۶ء میں کشمیری میگزین شروع کیا جو ۱۹۱۳ء میں ہفتہ وار ہو کر ۱۹۳۴ء تک جاری رہا اور اسی میگزین کے سوز و گداز پر مضامین اور تحریکات سے آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کی بنیاد پڑی بعد میں یہ اخبار کانفرنس کا مستقل آرگن بن گیا جس کی سینکڑوں کاپیاں وادیٔ کشمیر میں فروخت ہوئی تھیں۔ کانفرنس کی کوششوں سے کشمیریوں نے تعلیم کی طرف توجہ دینا شروع کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بچوں کو وظائف بھی مہیا کئے گئے''[۱۶]

یہاں تک کہ علامہ ان کوششوں میں بھی لگے رہیں کہ کشمیریوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے۔ اس ضمن میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''گویا انجمن کے ساتھ اقبال کا قرب روز بہ روز بڑھتا گیا اور جب اقبال اس کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے تو جہاں تک اہلِ کشمیر کی خدمت کا تعلق ہے ان کی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئیں۔ اُس زمانے میں کشمیریوں کے سامنے دو بڑے مسئلے تھے۔ ایک تو اہلِ کشمیر کے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ اور دوسرا انہیں زراعت پیشہ

قرار دینے کا سوال۔ اس سلسلے میں اقبال کی طرف سے محمد الدین فوق کے کشمیری میگزین میں اہلِ کشمیر کے نام دو گشتی چٹھیاں شائع ہوئیں''[۱۷]

علامہ کشمیریوں کی ذہانت کے مداح تھے

''وہ کشمیریوں کے روشن اور درخشندہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے جب بھی کہا یہی کہا کہ ایسا زرخیز ملک، ایسے روشن دماغ اور ذہین و ذکی لوگ اور ایسی متین و ہوشیار قوم ہمیشہ کے لئے کبھی غلام نہیں رہ سکتی۔ ان کی اُمید کا دامن یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر کشمیر کے لوگ بیدار ہو گئے، اُن کو زمانے کے ساتھ دینے کی توفیق ہوئی اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ یہ سارے ہندوستان کو بیدار کریں گے اور ان کے رہنما ثابت ہوں گے''[۱۸]

علامہ نے مختلف تنظیموں کے ذریعے سے کشمیریوں کی حالتِ زار کو دنیا کے سامنے رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

''اسی لئے وہ مختلف تنظیموں کے ذریعے کشمیریوں کے مسائل دنیا کے سامنے لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کشمیری خوابِ غفلت سے بیدار ہوں تا کہ وہ اپنے مقام اور مرتبے کو پہچان سکیں۔ انہوں نے کشمیریوں کے مسائل کی نثر و نظم میں بھرپور عکاسی کی ہے شاید اسی کے پیش نظر رئیس احمد جعفری نے لکھا کہ اقبال نے اپنے مکاتیب، خطبات، تقاریر، بیانات اور اشعار میں ''کشمیر کا مرثیہ'' لکھا''[۱۹]

علامہ نے جب بھی موقع پایا کشمیریوں کی فلاح کے لئے کوششیں کیں۔

''وہ ہر اس تحریک کے ہم درد تھے جو کشمیر کی صلاح وفلاح کی علم بردار
ہو وہ ہر اُس جماعت کے رفیق تھے جو کشمیر کا مسئلہ لیکر اُٹھے۔ انہیں ہر
اس تجویز سے ہم دردی تھی جو اہلِ کشمیر سے کسی نہج سے بھی متعلق ہو''[۲۰]

چنانچہ علامہ شخصی راج سے کشمیریوں کے حقوق بحال کرنے کے لئے کوشاں تھے اور اس بات پر ڈٹے تھے کہ کشمیری کسی نہ کسی طرح بیدار ہوں اور اپنے حقوق کی پامالی کے خلاف جدوجہد شروع کریں۔ غلام احمد مہجور کے نام ایک مراسلے میں اس مسئلے کی طرف علامہ اس طرح رقمطراز ہے:

''میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے
اگرچہ اس انقلاب کے لئے انہوں نے یہ شرطِ اولین رکھی تھی کہ
''کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح بیدار کی جائے''[۲۱]

غرض علامہ پوری زندگی ان کاوشوں میں رہے کہ کشمیریوں کو جہالت کی نیند سے کیسے بیدار کیا جائے تاکہ اُن کو انسانوں کی فہرست میں جگہ دلائی جائے کیونکہ شخصی راج کا کشمیریوں سے حیوانوں جیسا سلوک علامہ کی روح کو تڑپاتا جس سے اُن کی رگ رگ دُکھتی۔ اس کی وجہ خالص کشمیر اور کشمیریوں سے محبت تھی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''زندگی کے تمام ادوار میں کشمیر اور اہلِ کشمیر سے اقبال کی محبت اور اُن
کی غلامی اور کسمپرسی پر اقبال کی جگر کاوی مسلسل قائم رہی''[۲۲]

چونکہ کشمیری اس قدر مایوس وملول تھے کہ اُن کا مستقبل تاریک تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کشمیریوں کی حالت زار کچھ یوں تھی:

''بے تحاشا مظالم کی وجہ سے لوگوں میں قوت جستجو ختم ہو چکی تھی وہ
مختلف توہمات کے شکار ہو گئے تھے۔ تقدیر پرستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی
تھی۔ لوگوں نے عمل کے بجائے بے عملی اختیار کر لی تھی۔ اپنے آپ

کو بنانے اوراپنے مستقبل کو سنوارنے کی فکر کسی کو نہ تھی۔غلام وآقا کا نظریہ سماج میں بہت مقبول تھا۔جاگیردارانہ نظام نے لوگوں میں یہ توہم یقین میں تبدیل کیا تھا کہ آقا کی مرضی کے بغیر بندے کو روٹی نہیں مل سکتی۔آقا جاگیردار ہوتا تھا اور بندہ مزدور۔اس لئے کسی کو بھی اپنے آقا کے خلاف آواز اُٹھانے کی جرأت نہیں پر ماتی تھی''[۲۳]

علامہ کا اثر نہ صرف کشمیر کی سیاست پر پڑا بلکہ کشمیری شعرا پر بھی۔جنھوں نے کشمیریوں کو اپنی مقامی زبان میں بہت کچھ سمجھایا۔ان شعرا میں غلام احمد مہجور،عبدالاحد آزاد،غلام رسول نازکی،مرزا غلام حسن بیگ،دینا ناتھ نادم،عبدالستار رنجور،غلام بنی فراق اورغلام نبی خیال سرفہرست ہیں۔ان شعرانے علامہ کا کافی اثر اپنی شاعری میں قبول کیا ہے۔صوفی سُہیل کشمیری اقبال کے عنوان سے لکھتے ہیں

ظلمتِ شب مٹ گئی آفاق روشن ہوگیا
نوعِ انسان کو ملی پھر سے حیات بے نظیر

حواشی

۱۔ کلیم اختر، اقبال اور مشاہیر اقبال، گلشن پبلشرز، ص ۲۴۵۔

۲۔ کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئی والان دہلی، ص ۶۷۸۔

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئی والان دہلی، ص ۶۷۷۔

۷۔ کلیات اقبال فارسی، شیخ علی محمد اینڈ سنز (پرائیویٹ لمیٹڈ) پبلشرز، ص ۷۵۰۔

۸۔ باقیات اقبال، از سیّد الواحد معینی، آئینہ ادب، چوک مینار، انارکلی روڈ، لاہور ص ۳۳۔

۹۔ منشی محمد الدین فوق، مشاہیر کشمیر، بحوالہ اقبال اور مشاہیر کشمیر از کلیم اختر، ص ۲۴۷۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴۸۔

۱۱۔ اقبال نامہ، ص ۳۹۶، ۳۹۷، بحوالہ اقبال اور مشاہیر کشمیر از کلیم اختر، ص ۲۴۹۔

۱۲۔ اقبال اور مشاہیر کشمیر، ص ۲۷۱۔

۱۳۔ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اُردو، (دوسرا حصہ)، ۱۹۸۲ء، جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر، ص ۲۶۷، بحوالہ پی ایچ ڈی مقالہ، محمد اسد اللہ وانی، جموں یونیورسٹی جموں ۱۹۹۵ء، اقبال اور جموں و کشمیر کا اُردو ادب، ص ۳۱۔۳۲۔

۱۴۔ پی ایچ ڈی مقالہ محمد اسد اللہ وانی، جموں یونیورسٹی، جموں ۱۹۹۵ء، اقبال اور جموں و کشمیر کا اردو ادب، ص ۳۵۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۷۔

۱۷۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اقبال اور کشمیر، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ص ۸۸۔

۱۸۔ محمد عبداللہ قریشی، حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں، ص ۱۶۳۔

۱۹۔ پی ایچ ڈی مقالہ ،محمد اسد اللہ وانی، جموں یونیورسٹی، جموں ۱۹۹۵ء، اقبال اور جموں و کشمیر کا اردو ادب، ص ۴۲۔
۲۰۔ رئیس احمد جعفری، اقبال اور سیاست ملی، اشاعت دوم ۱۹۸۱ء، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ص ۱۵۳۔
۲۱۔ غلام نبی خیال، اقبال اور تحریک آزادی، کشمیری رائٹرس کانفرنس، سرینگر، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۸۔
۲۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، ص ۵۵۔
۲۳۔ محمد شفیع سمبلی، مقالہ برائے ایم فل، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء، کشمیری شعراء پر اقبال کا اثر، ص ۲۔

IQBAL INSTITUTE
University of Kashmir, Srinagar

Printed at : Sharjah Printing Press, Sgr. Ph: 2482160, 9906566242